ملک راج انند
اچھوت

اچھوت

مصنف

ملک راج آنند

(ای۔ ایم۔ فارسٹر کے دیباچے کے ساتھ)

مترجم

م۔ م۔ راجندر

ساہتیہ اکادمی

Achhoot : Urdu translation by M.M. Rajinder of Mulk Raj Anand's novel *Untouchable* in English. Sahitya Akademi, New Delhi (1990), Rs. 50.

پہلا اڈیشن : ۱۹۹۰ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، ۳۵۔ فیروز شاہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلس آفس : سواتی، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

بلاک ۲ ۔ بی، رویندر سرووراسٹیڈیم۔ کلکتہ ۲۹ ۔۷۰۰۰

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

۲۹، ایلڈامس روڈ، تینام پیٹھ، مدراس ۶۰۰۰۱۸

قیمت : ۵۰ روپے

سپر پرنٹرس، دلی۔ ۵۱ میں طبع کرواکے شائع کیا

دیباچہ

کچھ سال ہوئے مجھے اپنی لکھی ہوئی کتاب ' A PASSAGE TO INDIA '
(ہندوستان کا ایک سفر) کی ایک جلد دیکھنے کو ملی جسے ظاہرہ طور پر کسی ناراض کرنل نے پڑھا تھا۔ اُس نے اپنے جذبات کو چھپایا نہیں تھا۔ پہلے ہی صفحے پر اُس نے لکھا تھا۔ "پڑھنے کے بعد اِسے جلادو۔" اور نیچے کی طرف لکھا ہوا تھا۔ "بڑی گندی ذہنیت کا آدمی ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۱۵۔" میں نے قابلِ معافی عجلت سے صفحہ ۲۱۵ کھولا۔ وہاں مجھے یہ الفاظ ملے "بھنگیوں نے ابھی ابھی ہڑتال کردی ہے اور نتیجے کے طور پر چندر پور کے آدھے کموڈ بغیر صاف ہوئے رہ گئے۔" اِس ہلکے پھلکے اظہارِ خیال نے مجھے ہمیشہ کے لیے فوجی سماج سے بے گانہ کردیا۔

بہرحال اگر اُس کرنل نے "ہندوستان کا ایک سفر" کو گندا اور تحقیر آمیز سمجھا تو وہ "اچھوت" کے بارے میں کیا سوچے گا جس میں ایک بھنگی کی زندگی کے ایک دن کو ہر حال اور واقعے کے ساتھ پوری اصلیت سے بیان کردیا گیا ہے؟ وہ غالباً یہ کہے گا۔ "میں اِس کتاب کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔" نہ میں بھروسہ کرسکتا ہوں مگر میری وجہ کچھ اور ہے۔ میں اِسے ناقابلِ بیان حد تک صاف ستھری سمجھتا ہوں اور میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن میں مَیں اِسے بیان کرسکوں۔ بغیر کسی بلند آہنگی اور شوکتِ الفاظ کا سہارا لیے، اِس نے سیدھا موضوع کے مرکز کو چھولیا ہے اور اُسے پاکیزہ اور ارفع بنا دیا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی پاک اور صاف نہیں ہے۔ اگر ہم ایسے ہوتے تو زندہ نہ رہتے۔ لیکن سیدھے اور صاف گو آدمی کے لیے سادے معاملے پاک اور صاف ہوسکتے ہیں اور

آنند صاحب کی کامیابی کی شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کا حملہ براہِ راست ہے۔

انسانی جسم کے رفعِ حاجت کی بات کو کتنا عجیب و غریب کاروباری معاملہ بنا دیا گیا ہے! قدیم یونانی اِس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے اور وہ سب سے زیادہ دانش مند اور خوش تھے۔ لیکن ہماری تہذیب اور ہندوستانی تہذیب دونوں حیران کن گتھیوں میں الجھ گئی ہیں۔ ہماری اپنی گرہ تو صرف سَو سال پہلے لگی تھی اور ہم میں سے کچھ اِسے کھولنے کی امید کر رہے ہیں۔ یہ بات ایک تصنّع اور دیدہ دانستہ چپ سادھنے کی صورت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ ہمیں بچپن سے یہ سکھایا گیا ہے کہ انسانی جسم سے نکلے ہوئے فُضلے کو بُرا اور باعثِ شرم سمجھیں۔ اِس بات نے بہت سی بھیانک برائیوں کو جنم دیا ہے جن میں جسمانی اور نفسیاتی دونوں شامل ہیں اور جن کے ساتھ ہماری جدید تعلیم نبٹنے کی کوشش شروع کر رہی ہے۔ ہندوستان کی گتھّی کچھ اور نوعیت کی ہے۔ ہندوستانی، دوسرے مشرقی لوگوں کی مانند کمال کے صاف گو ہیں۔ وہ کام کرنے کے بارے میں ہماری طرح کے کچھ پیچیدہ نظریات کے شکار نہیں ہیں۔ وہ رفعِ حاجت کو ایک ضروری اور قدرتی عمل مانتے ہیں جیسے کہ نیند۔ لیکن، اِس کے برعکس، اُنھوں نے اِس معاملے کو ایک قابلِ نفرت دہشت کی حد تک پہنچا دیا ہے جس کا مغرب کو احساس تک نہیں۔ یہ قابلِ نفرت دہشت وہ عقیدہ ہے کہ انسانی بَول و براز گندی اور ناخوشگوار اشیا ہیں اور اِن کے تمام اٹھانے والے یا صاف کرنے والے ہمارے سماج کے نکالے ہوئے افراد ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف انسان ہی اس طرح کی گری ہوئی اور شیطنیت سے پُر بات سوچ سکتا ہے۔ کسی جانور کو یہ بات کبھی نہ سوجھ سکتی۔ جیسا کہ آنند صاحب کا ایک کردار کہتا ہے — " وہ سوچتے ہیں کہ ہم گندگی ہیں کیونکہ ہم اُن کی گندگی صاف کرتے ہیں "

بھنگی ایک غلام سے بھی بدتر ہے کیونکہ غلام کے لیے اپنے آقا اور اپنے کام کو بدلنا ممکن ہے لیکن بھنگی تو ہمیشہ کے لیے بندھا ہوا ہے۔ وہ جس ماحول میں پیدا ہوا ہے، اُس کے لیے اس سے چھٹکارا کبھی ممکن نہیں۔ اُسے اپنی پیدائش کی بنا پر ہر قسم کے سماجی میل جول سے خارج کر دیا گیا ہے اور نہ اسے اپنے مذہب سے ہی کوئی سہارا ملتا ہے۔ وہ خود گندا ہے اور اُن لوگوں کو بھی جنھیں وہ چھوئے گا، گندا بنا دے گا

اور انھیں اپنے آپ کو پاک صاف کرنا پڑے گا۔ انھیں اپنے دن بھر کے کاموں کو نئے سرے سے ترتیب دینا ہوگا۔ اِس لیے ایک اچھوت جب سڑک پر چلتا ہے تو قدامت پسند ہندوؤں کے لیے ایک پریشان کُن، قابلِ نفرت شے ہے۔ اُس اچھوت کا یہ فرض ہے کہ وہ چلتے ہوئے آواز لگاتا جائے اور اپنے آنے کے بارے میں آگاہ کرے۔ اِس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ گندگی اُس کی روح میں گھُس گئی ہے اور وہ خود اپنے آپ کو بعض دفعہ ایسا ہی محسوس کرتا ہے جیسے دوسرے اسے سمجھتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنا نیچ ہے کہ وہ اِس کے بارے میں سوچتا تک نہیں! لیکن یہ رائے اُن لوگوں کی نہیں ہے جنھوں نے اُس کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ نہ ہی ایسا میری اپنی حقیر شہادت سے ثابت ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی میں ہندوستان گیا تو میں نے دیکھا کہ بھنگی زیادہ حسّاس نظر آنے والے اور دوسرے ملازموں کے مقابلے میں بہتر شخصیت کے مالک تھے۔ میں ایک ایسے بھنگی کو بھی جانتا تھا جو تھوڑی بہت شاعری بھی کرلیتا تھا۔

"اچھوت" کا مصنف صرف ایک ہندوستانی ہی ہوسکتا تھا جو باہر سے مشاہدہ کرتا رہا ہو۔ کوئی بھی یوروپین چاہے اُسے کتنی بھی ہمدردی کیوں نہ ہو "باکھا" کردار تخلیق نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی تخلیق کے لیے اُس کی واقفیت کافی نہیں ہوسکتی تھی۔ اور نہ ہی کوئی اچھوت اس کتاب کو لکھ سکتا تھا کیونکہ وہ حقارت آمیز غصے اور کم مائگی میں مبتلا ہوتا۔ آنند صاحب اِس کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں۔ ذات سے وہ چھتری ہیں اور امید تو یہی کی جاسکتی تھی کہ انھیں بھی بھنگیوں کے بارے میں احساسِ ناپاکی وراثت میں ملا ہوگا۔ لیکن اپنے بچپن میں وہ ایک ہندوستانی رجمنٹ میں کام کرنے والے بھنگیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے اور اِس طرح سے وہ اُن سے پیار کرنے لگے اور ایک ایسے الیے کو سمجھنے لگے جو اُن کا حصّہ نہیں تھا۔ اُن میں قدرے علیحدگی اور دور بینی کی صحیح آمیزش ہے اور اِس حقیقت نے کہ وہ فلسفے کے راستے سے ناول نگاری کی طرف آئے انھیں ایک خاص گہرائی عطا کردی ہے۔ یہ امر انھیں مہمل بھی بنا سکتا تھا، جو ہر مسئلے کو عمومیت عطا کرنے والے ذہن کی لعنت ہے، لیکن اُن کا ہیرو کوئی مصیبت سہنے والی غیر مرئی شے نہیں ہے۔ باکھا تو

خون اور پوست کا ایک انسان ہے جو بڑا پیارا ہے مگر جس کی خواہشات کو پنپنے نہیں دیا جاتا، جو بعض اوقات شاندار، کبھی کمزور مگر ہمیشہ خالص ہندوستانی ہے۔ جسمانی طور پر بھی وہ کئی خصوصیتوں کا مالک ہے۔ ہم اُس کے وسیع، ذہین چہرے کو پہچان سکتے ہیں اور جب وہ اپنا گندا کام کرتا ہے یا اکڑ کر اپنے فوجی بوٹوں میں، شہر کی سڑکوں پر، اپنے ہاتھوں میں سستی مٹھائی کسی کاغذ میں تھامے ایک عمدہ سیر کی امید میں نکلتا ہے، تو اس کے شاندار جسم اور بھاری کولہوں کو بھی پہچان لیتے ہیں۔

اِس کتاب کا تانا بانا بڑی سادگی سے سوچا اور بُنا گیا ہے لیکن اِس کی اپنی ہیئت بھی ہے۔ سارا عمل صرف ایک دن پر مشتمل ہے اور سب کچھ ایک چھوٹے سے خطّے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ "چھُو جانے" کا تباہ کن حادثہ صبح کے وقت ہوتا ہے (صفحہ ۵۴) اور یہ حادثہ بعد کے ہونے والے واقعات میں زہر گھول دیتا ہے، جن میں خوشگوار واقعات بھی شامل ہیں جیسے کہ ہاکی کا میچ اور باہر کی طرف کی سیر۔ نشیب و فراز کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے ہم حل کی طرف پہنچتے ہیں بلکہ تین حلوں کی طرف جن کے ساتھ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ پہلا حل تو پادری ہچنسن کا ہے یعنی مکتی دلانے والے مشنریوں کا، یسوع مسیح کا۔ اگرچہ باکھا کے دل پر اِس بات کو سُن کر بڑا اثر ہوتا ہے کہ یسوع مسیح سب انسانوں کو خوش آمدید کہتا ہے چاہے اُن کی کوئی بھی ذات ہو لیکن وہ تنگ آ جاتا ہے جب پادری اسے یہ نہیں بتا سکتا کہ یسوع مسیح کون ہے۔ پھر دوسرا حل آتا ہے جس میں ایک گونج کا سا اثر ہے یعنی گاندھی۔ گاندھی بھی کہتے ہیں کہ تمام ہندوستانی برابر ہیں اور اُن کا یہ بیان کہ ان کے آشرم میں ایک برہمن بھی بھنگی کا کام کرتا ہے سیدھا باکھا کے دل میں اتر جاتا ہے۔ اِس کے بالکل بعد تیسرا حل آتا ہے جو ایک جدید شاعر کے منہ سے نکلتا ہے۔ یہ عام اور سیدھا ہے اور جو کچھ کتاب میں اب تک ہوتا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بڑا صحیح اور قابلِ اطمینان حل ہے۔ اچھوتوں کو بچانے کے لیے کسی دیوتا کی ضرورت نہیں ہے، نہ اِس کے لیے یہ ضروری ہے کہ زیادہ خوش قسمت ہندوستانی اپنے آپ کو محروم رکھیں اور قربانی کرنے کے عہد و قول کریں، بلکہ اِس کا صرف ایک اور سادہ حل ہے — فلش سسٹم۔ سارے ہندوستان میں اگر فضلے کے اخراج کے لیے زمین دوز

نالیاں اور پانی پھینکنے والی ٹنکیاں بن جائیں تو چھوا چھوت کی یہ لعنت ختم ہو جائے گی۔ کچھ پڑھنے والوں کو کتاب کا یہ آخری حصّہ شاید ضرورت سے زیادہ نمائشی اور غیر فطری یا غیر خالص نظر آئے، اُس عمدہ اور صاف مشاہدے کے مقابلے میں جو کتاب میں اِس سے پہلے آیا ہے، لیکن مصنف کے منصوبے کا یہ ایک اٹوٹ حصّہ ہے۔ یہ ایک ناگزیر نقطۂ انتہا ہے اور یہ سہ گنا اثر کے ساتھ ابھر کر آیا ہے۔ باکھا اپنے باپ کے پاس واپس چلا جاتا ہے، اپنے اُسی بدبخت بستر پر، اور کبھی وہ مہاتما کے بارے میں سوچتا ہے اور کبھی مشین کے بارے میں جو فلش کرتی ہے۔ اس کا ہندوستانی دن ختم ہو جاتا ہے اور اگلا دن بھی بالکل اُسی طرح ہوگا لیکن، اگر آسمان کی گہرائیوں میں نہیں، تو اِس دھرتی کی سطح پر، ایک تبدیلی تو جلد ہی آنے والی ہے !

ای۔ ایم۔ فارسٹر

اچھوت

ذات سے خارج شودروں کی بستی مٹّی کی دیواروں کے گھروں کا ایک مجموعہ تھی۔ یہ گھر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دو قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ یہ کالونی شہر اور چھاؤنی کے زیرِ سایہ ہی تھی مگر ان کی حدود سے باہر اور اُن سے الگ تھلگ۔ اِس میں بھنگی، موچی، دھوبی، نائی، کمہار، گھسیارے اور ہندو سماج کے دوسرے ذات سے باہر کیے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ اِس کے پاس ہی ایک ندی بہتی تھی جس کا پانی کبھی شیشے کی طرح صاف تھا۔ لیکن اب اس کے پاس ہی بنی ہوئی سرکاری ٹٹیوں کی گندگی، مردہ جانوروں کے پنجروں اور کھالوں کی بدبو سے جو اِس کے کنارے سوکھتے تھے، گدھوں، بھیڑوں، گھوڑوں، گایوں اور بھینسوں کے گوبر اور لید سے، جسے ڈھیر کر کے اُپلے تھاپنے کے لیے رکھ دیا جاتا تھا، اور اِس کے کناروں سے نکلتی ہوئی تعفن آمیز، گندی اور گھٹن پیدا کرنے والی بدبو کے بھبکوں سے، یہ پانی بالکل گندا ہو گیا تھا۔ چونکہ اِس علاقے میں پانی کے نکلنے کے لیے کسی قسم کی نالیاں نہیں تھیں، اس لیے کئی برساتوں کا پانی اکٹھا ہو گیا تھا جس نے تمام بستی کو ایک دلدل بنا دیا تھا۔ اِس میں سے ہر وقت ایک ناقابلِ برداشت بدبو آتی رہتی تھی۔ انسانوں اور جانوروں کے بیلے اور گندگی کے ڈھیروں نے جو اِس چھوٹی سی بستی کے چاروں طرف پڑے رہتے تھے اور اِس کے اندر کی گندگی، بدصورتی، تاریکی اور مصیبتوں نے اِس بستی کو ہر طرح سے ناقابلِ رہائش، بنا دیا تھا۔

کم از کم باکھا یہی سوچتا تھا۔ باکھا لاکھا کا لڑکا تھا جو شہر اور چھاؤنی میں کام کرنے والے تمام بھنگیوں کا

جمعدار تھا۔ لاکھا سرکاری طور پر، سرکاری ٹٹیوں کی تین لائنوں کا انچارج تھا جو اس کالونی کے بالکل آخری سرے پر ندی کے کنارے بنی ہوئی تھیں۔ باکھا کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ مضبوط جسم کا طاقتور نوجوان تھا۔ باکھا گوروں کی ایک رجمنٹ کی بارکوں میں، اپنے ایک دُور پار کے چچا کے ساتھ، ایک امیدوار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ گوروں کی زندگی کی شان و شوکت سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ ٹامیوں نے اس کے ساتھ ایک انسان کا سلوک کیا تھا اور باکھا بھی اپنے آپ کو اپنے ساتھ کے دوسرے لوگوں سے بہتر سمجھنے لگا تھا۔ ورنہ باقی کے نچلی ذات کے لوگ، جو بھی اُن کی حالت تھی، اُسی پر قناعت کرتے تھے، سوائے چمار کے لڑکے چھوٹا اور دھوبی کے لڑکے رام چرن کے۔ چھوٹا اپنے بالوں میں خوب تیل لگاتا تھا، انگریزوں کی طرح ٹیڑھی مانگ نکالتا تھا، ہاکی کھیلتے ہوئے نیکر پہنتا تھا اور اُن ہی کی طرح سگرٹ پیتا تھا۔ رام چرن باری باری چھوٹا اور باکھا کی نقل کرتا تھا۔

موسم خزاں کا ایک بے کیف دن تھا اور باکھا اپنے پانچ فٹ چوڑے اور بارہ فٹ لمبے ایک کمرے کے تاریک، گندے اور کچے مکان کے ایک کونے میں، ایک رنگ اُڑی ہوئی دری کے اوپر، زمین پر، ایک گھِسا ہوا چکنائی لگا کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا اور اپنے اِس رہنے کے ناقابل گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے بعد اس کی بہن ایک چارپائی پر سوئی پڑی تھی اور ذرا ہٹ کر، ایک ٹوٹی ہوئی بان کی چارپائی پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے پیلی مٹی کے رنگ کے لحاف کے اندر اس کا باپ اور بھائی خرّاٹے لے رہے تھے۔

دن جتنے گرم ہوتے تھے، راتیں اُتنی ہی ٹھنڈی ہو جاتی تھیں۔ بُلاشاد کے شہر میں موسم ایسا ہی رہتا تھا۔ اور اگرچہ باکھا گرمیوں اور جاڑوں، دونوں میں اپنے دن بھر کے پہنے ہوئے کپڑوں میں ہی سو جاتا تھا مگر صبح سویرے ندی کی طرف سے آنے والی تیز اور کاٹنے والی ہوا، کمزور کمبل میں سے گھُستی ہوئی اُس کی کھال تک اتر جاتی تھی۔ اُس کا پہنا ہوا اوور کوٹ، برجیس، پٹیاں اور ملٹری کی وردی کے بوٹ تک اِس ہوا کو نہ روک سکتے۔

کروٹ لیٹے ہوئے باکھا کانپ گیا۔ لیکن اُس نے ٹھنڈ کی پروا نہیں کی اور

اِسے خوشی سے برداشت کرتا رہا کیونکہ وہ اُس کی خاطر جسے وہ 'فیشن' کہا کرتا تھا۔ بہت سے آراموں کو قربان کر سکتا تھا۔ 'فیشن' سے اس کا مطلب پتلون، برجیس، کوٹ، پٹی اور بوٹ پہننا تھا جیسا کہ ہندوستان میں انگریز اور ہندوستانی فوجی پہنتے تھے۔ "او اپنی ماں کے خصم" ایک دفعہ اس کے باپ نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا تھا "رضائی لے لے اور چارپائی پر بستر بچھا کر لیٹ۔ گوروں کے اِس کمبل کو پھینک دے ورنہ اِس پتلے کپڑے میں ٹھنڈ سے مر جائے گا" لیکن باکھا تو جدید ہندوستان کا بچہ تھا۔ اُس کے ناپختہ ذہن کو تو یوروپین لباس کی وضع قطع نے متاثر کیا ہوا تھا۔ اِس انتہائی سادہ لوحی نے اُس کے پرانے ہندوستانی احساس کو تُکیکڑ دیا تھا اور اُس میں کچھ نئی گہری شکنیں ڈال دی تھیں جن میں وہ تمام وجوہات جن کی بنا پر ہندوستان نے ایک گھیرے دار ڈھیلے ڈھالے لباس کو اپنا لیا تھا، سوئی پڑی تھیں۔ باکھا نے ٹامیوں کو دیکھا تھا اور انھیں حیران اور ششدر ہو کر گھورا تھا، جب وہ اپنے چچا کے ساتھ برٹش رجمنٹ کی بارکوں میں رہنے گیا تھا۔ وہاں ٹھہرنے کے دوران اُس نے ٹامیوں کی زندگی کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔ وہ عجیب و غریب کنوئیں کے نیچے پلنگوں پر سوتے تھے جو کمبلوں سے پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ انڈے کھاتے تھے اور ٹین کے مگوں میں چائے اور شراب پیتے تھے۔ اُس نے انھیں پیریڈ میں جاتے دیکھا تھا اور پھر بازار کی طرف ٹہل کر چلتے ہوئے۔ اُن کے منہ میں سگرٹیں ہوتیں اور ہاتھوں میں چاندی کے مُٹھ والی چھڑیاں۔ اسے جلد ہی ایک شدید خواہش نے جکڑ لیا کہ وہ بھی ان ہی کی طرح زندگی بسر کرے گا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ صاحب لوگ تھے یعنی زیادہ اعلیٰ آدمی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ جو اُن کی طرح کپڑے پہنے گا وہ بھی صاحب بن جائے گا۔ اِس لیے اُس نے اُن کی ہر بات میں نقل کرنے کی کوشش کی اور یہ نقل اُس نے اپنے مخصوص ہندوستانی حالات میں جتنی اچھی ہو سکتی تھی، کی۔ اُس نے ایک ٹامی سے درخواست کی کہ اسے اپنی کوئی پتلون بخشش کے طور پر دے دے۔ اُس ٹامی نے اسے ایک برجیس دیدی جو اس کے پاس فالتو تھی۔ ایک ہندو فوجی نے مہربانی کر کے اُسے بوٹ اور پٹیاں مفت میں دے دیں۔ دوسری چیزوں کے لیے باکھا شہر میں کباڑی کی دکان پر چلا گیا تھا۔ وہ اِس دکان کو بہت عرصے سے دیکھتا آیا تھا۔ جب وہ بچّہ ہی تھا؛ اُس وقت سے وہ اِس لکڑی کی

دکان کے سامنے سے گزرتا رہتا تھا جس میں ٹامیوں کی ردّی کے طور پر بیچی ہوئی متفرق اشیا کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ کئی چیزیں وہ گروی رکھ جاتے تھے۔ اِن اشیا میں سرخ رنگ کے کپڑے، وردیاں، سولر ہیٹ، آگے کو نکلی ہوئی پیک ٹوپیاں، چاقو، چھریاں، کانٹے، عمدہ بٹن، پرانی کتابیں اور اینگلو انڈین زندگی کی کئی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ وہ انھیں چھونے کے لیے تڑپتا تھا لیکن اُس میں یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی تھی کہ دکاندار تک پہنچے اور اُس سے کسی چیز کی قیمت دریافت کرے۔ اسے خدشہ تھا کہ دکاندار کی بتائی ہوئی قیمت اُس کی طاقت سے باہر ہوگی اور کہیں دکاندار اُس کی بات سے یہ نہ پتہ لگالے کہ وہ تو ایک بھنگی کا لڑکا تھا۔ اِس لیے وہ چیزوں کو صرف گھور کر دیکھتا رہتا تھا اور نظریں بچا کر اُن کی عجیب وغریب عمدہ تراشی ہوئی شکلوں کو دیکھ لیتا تھا۔ "میں بھی ایک صاحب کی طرح نظر آؤں گا" وہ دل ہی دل میں کہتا، "اور میں اُن ہی کی طرح چلوں گا۔ جیسا وہ کرتے ہیں، میں بھی کسی کے ہمراہ چلا کروں گا۔ اِس معاملے میں چھوٹا میرا ساتھی ہوگا۔ لیکن میرے پاس تو اِن چیزوں کو خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں" اور اِس کے ساتھ ہی اُس کے تصوّرات کا تانا بانا ٹوٹ جاتا اور شکست خوردہ، ملول خاطر ہو کر وہ دکان سے آگے بڑھ جاتا۔ پھر اُس کی قسمت چمکی اور انگریزوں کی بارکوں میں اُسے کچھ پیسے مل گئے۔ اُسے کام کرنے کی جو تنخواہ ملتی تھی وہ تو بلاشبہ باپ کو دینی پڑتی تھی لیکن ٹامیوں سے جو بخشش اسے ملی تھی وہ دس روپے بن گئی تھی۔ اگرچہ وہ اِس رقم میں وہ تمام اشیا تو جو وہ کباڑی کی دکان سے خریدنا چاہتا تھا، نہیں لے سکتا تھا مگر وہ ایک جیکٹ اور کوٹ اور وہ کمبل جس میں وہ سوتا تھا، خرید سکا اور "سرخ لالٹین" (ریڈ لیمپ) کی سگرٹوں کا لطف اٹھانے کے لیے اس کے پاس کچھ آنے بھی بچ گئے۔ اُس کا باپ اس کی اِس فضول خرچی پر بہت بگڑا اور کالونی کے لڑکے بھی، یہاں تک کہ چھوٹا اور رام چرن بھی، اُسے اُس کے اِس نئے لباس کی وجہ سے "پلپلی صاحب" کہہ کر اُس کا مذاق اڑانے لگے۔ باکھا خود بھی یہ جانتا تھا کہ انگریزی کپڑوں کے سوا اُس کی زندگی میں کوئی چیز انگریزی نہیں تھی۔ لیکن اُس نے سختی سے اپنی نئی شکل کو برقرار رکھا اور وہ دن رات یہی کپڑے پہنے رہتا۔ وہ ہندوستانی پن کے ہر حقیر دھبّے سے بچتا تھا حتیٰ کہ بھدّی شکل کے ہندوستانی لحاف کو بھی نہیں اوڑھتا تھا، حالانکہ وہ رات کو ٹھنڈ سے

کانپتا رہتا تھا۔

باکھا کے گرم، مضبوط جسم میں خنکی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے کروٹ لی اور اندھیرے میں انتظار کرنے لگا، مگر کس بات کا، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ یہ راتیں بڑی خراب تھیں، اتنی ٹھنڈی اور بے آرام۔ اُسے دن بڑے پسند تھے کیونکہ دن میں سورج چمکتا تھا اور وہ کام کرنے کے بعد اپنے کپڑوں کو برش سے صاف کر سکتا تھا اور باہر سڑکوں پر نکل کر اپنے سب دوستوں کے لیے باعثِ رشک بنا ہوا گھوم سکتا تھا۔ اِس طرح سے وہ ذات سے باہر لوگوں کی اس بستی میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بن جاتا۔ لیکن یہ راتیں! "مجھے ایک دوسرا کمبل لینا پڑے گا۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا "پھر باپو بھی مجھے لحاف اوڑھنے کو نہیں کہے گا۔ وہ ہمیشہ مجھے گالیاں دیتا رہتا ہے۔ میں اُس کا سارا کام کرتا ہوں۔ وہ ساری تنخواہ خود رکھ لیتا ہے۔ وہ سپاہیوں سے ڈرتا ہے۔ وہ اُسے گالیاں دیتے ہیں۔ وہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔ جب وہ اُسے جمعدار کہتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اُسے اپنی عزت پر بڑا غرور ہے۔ وہ دوسروں سے سلام لینے کے لیے گھومتا پھرتا ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے آرام نہیں کرتا۔ پھر بھی وہ مجھے گالیاں دیتا رہتا ہے۔ اور اگر میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے باہر چلا جاتا ہوں تو وہ مجھے کھیل کے بیچ میں ہی بلا لیتا ہے کہ جا کر ٹٹیاں صاف کر۔ وہ بوڑھا ہے اور اسے صاحب لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں پتہ۔ اور وہ مجھے پکارے گا کہ اٹھ جب کہ سخت ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ وہ خود بستر میں لیٹا رہے گا۔ جب میں ٹٹیاں صاف کرنے جاؤں گا تو راکھا اور سوہنی بھی سوئے پڑے ہوں گے۔" اس نے اپنا سیاہ، چوڑے اور گول چہرے پر شکنیں ڈالیں اور اسے ایک درد کا احساس ہوا جو اُس کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ اس درد کی وجہ سے اُس کے خوبصورت خد و خال مسخ ہو گئے اور بدصورت سے لگنے لگے۔ اِسی حالت میں وہ باپ کی آواز کی انتظار میں لیٹا رہا۔ اُسے باپ کا چلا کر آواز دینا بڑا بُرا لگتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اُس کے کھردرے تحکمانہ انداز میں اٹھنے کے حکم کے انتظار میں فکرمند ہو کر لیٹا رہا۔

"اُٹھ او باکھیا، سور کے بچے۔" اس کے باپ کی آواز کھردرے، بار بار ٹوٹتے خراٹوں کے سلسلے میں نکلتی ہوئی گولی کی مانند نشانے پر لگی۔ "اٹھ اور ٹٹیاں صاف کر آ

ورنہ سپاہی ناراض ہو جائیں گے۔"

بوڑھا جمعدار ہر روز صبح، اسی وقت، جیسے کوئی اندرونی حس کام کرتی ہو، جاگ پڑتا، اور پھر اپنے پیوند لگے، رنگ اُڑے، موٹے، میلے اور چکنائی آلود لحاف میں سو جاتا اور خراٹے لینے لگتا۔

باکھا نے آدھی آنکھیں کھولیں اور باپ کے چلانے کی آواز سن کر فرش پر سے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ آج صبح پہلے ہی سے بڑا پژمردہ محسوس کر رہا تھا اور اسے باپ کی گالی پر غصہ آیا۔ غصے کے مارے اس کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں زردی مائل ہوگئیں۔ اس کے ذہن میں وہ دن گھوم گیا جب ماں کی موت کے بعد صبح کو اگرچہ وہ جاگا ہوا تھا لیکن اس کا باپ سمجھا تھا کہ وہ سویا پڑا ہے اور جاگے گا نہیں۔ اسی لیے وہ چلا پڑا تھا۔ بس اُس کے بعد باپ کے صبح سویرے چلانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں تو باکھا نے اس کی مزاحمت اس شکل میں کی تھی کہ سن کر بہرا بنا رہتا اور اب تو وہ غصے کے مارے اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ صبح جاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ عام طور پر تو وہ اپنی نیند سے کافی جلد اٹھ جاتا تھا۔ اُس کی ماں نے اُسے یہ عادت ڈالی تھی۔ وہ اسے ایک پیتل کے گلاس میں ابلا ہوا پانی، جس میں چائے کی پتی اور دودھ پڑا ہوا تھا، مٹی کی ہنڈیا میں سے نکال کر جو اُن کے ایک کمرے کے مکان کے ایک کونے میں دو اینٹوں والے چولہے پر ہر وقت رکھی رہتی تھی، دے دیتی تھی۔ اس گرم گرم میٹھی چائے کا ذائقہ اتنا مزیدار ہوتا کہ صبح اس کے پینے کے خیال سے ہی رات کو سوتے وقت باکھا کے منہ میں پانی بھر آتا۔ اور اسے پینے کے بعد وہ اپنے کپڑے پہنتا اور خوش اور مطمئن ٹٹیوں پر اپنے کام کے لیے پہنچ جاتا۔ جب اُس کی ماں مر گئی اور گھر کی دیکھ بھال کا بوجھ اُس پر پڑا تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں رہا کہ صبح سویرے گرم چائے کے گلاس کے آرام یا آسائش کی امید کرتا۔ اس لیے اس نے اس کے بغیر ہی جینا سیکھ لیا لیکن کبھی کبھی بڑی حسرت سے وہ اُن دنوں کو یاد کرتا جب وہ نہ صرف صبح کے ناشتے کے وقت مزے دار چٹپٹی چیزیں کھاتا بلکہ زندگی کے کئی ایسے آرام بھی اسے ملتے جیسے کہ اچھے اچھے کپڑے جو اُس کی ماں اس کے لیے خریدتی، اور شہر کے بار بار چکر اور خالی خالی لمبا دن جس میں وہ خوب کھیلتا کودتا۔ وہ اکثر اپنی ماں کے بارے میں سوچتا، چھوٹی سی، سیاہ رنگ

کی جو ڈھیلے ڈھالے پاجاموں کے اوپر ایک کرتہ پہنے رہتی اور کُرتے پر ایک اور کپڑا ڈال لیتی۔ وہ جھکی جھکی گھر میں کھانا پکانے اور صفائی وغیرہ کا کام کرتی رہتی۔ وہ باکھا کے بڑھتے ہوئے جدید شوق کے پیشِ نظر، کچھ پرانے فیشن کی تھی۔ وہ پکّی ہندوستانی تھی، اور بعض اوقات تو تکلیف وہ حد تک (کیونکہ وہ باکھا کے یوروپین کپڑوں کے دکھاوٗ کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی) لیکن بہت پیار کرنے والی، بہت نیک اور بہت فراخدل جو بس ہمیشہ دیتی رہتی تھی اور اُس کے لیے چیزیں خریدتی رہتی تھی۔ سراپا رحم کی پُتلی۔ تاہم یہ سوچ کر کہ وہ مر گئی تھی، وہ اداس نہیں ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ غم کو اُس دنیا میں داخل کرے جس میں وہ رہتا تھا، وہ دنیا جو اس کے ولایتی کپڑوں اور لال لٹین کی سگرٹوں پر مشتمل تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اُس کی ماں اِس دنیا کی نہیں تھی، اور اب اُس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"کیا تو ابھی اُٹھا نہیں؟ او حرام کی اولاد اٹھ جا" اس کا باپ چلّایا۔ اُس کی آواز نے لڑکے کو پھر جھٹک کر ایک ناامیدی کے احساس تک پہنچا دیا۔

"ظالم کہیں کا" باکھا اپنے آپ میں بڑبڑایا جب اُس نے اپنے باپ کے آخری الفاظ ایک دمے والی کھانسی کی صورت میں سنے۔ اس نے اپنے آپ کو جنبش دی اور دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے باپ کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ باپ کے چلّانے کے ساتھ ہی اُسے اِس گندے، اندھیرے اور بھیڑ والے چھوٹے سے کمرے کا احساس بھی کاٹنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اُس کی ہڈیاں بھی کچھ اکڑ گئی تھیں اور ٹھنڈ کے مارے اس کا جسم بے حس ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا کہ اسے بخار سا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں سے گرم گرم پانی نیچے ٹپک پڑا۔ اس کا ایک نتھنا بند معلوم دیا اور اس نے ہوا کو سونگھا تاکہ وہ ٹھیک سے سانس لے سکے کیونکہ اس کونے کا ماحول جس طرف اس کا چہرہ مڑا ہوا تھا، بڑا گھٹا گھٹا تھا۔ اس کا گلا بھی کچھ خراب معلوم ہوتا تھا کیونکہ جب وہ سانس لیتا تھا تو گلے میں چبھن سی ہوتی تھی۔ وہ اپنے گلے اور ناک کو کھولنے کے لیے زور زور سے سانس لینے لگا۔ جب سانس کے ساتھ ہوا اس کے بند نتھنے کو چیرتی ہوئی گھُسی تو دوسرا بری طرح بند ہو گیا۔ اسے کھانسی آگئی جس نے اس کے بند گلے کی نس نس کو بری طرح جھنجوڑ دیا اور اُس نے اس کونے میں جہاں وہ لیٹا ہوا تھا

بری طرح تھوک اُگل دیا۔ وہ اپنی کہنی کا سہارا لے کر جھکا اور اُس نے دری کے نیچے جس پر وہ لیٹا ہوا تھا اپنی ناک صاف کی۔ وہ پھر لیٹ گیا اور اپنی ٹانگوں کو جوڑ کر انھیں کمبل کی پتلی تہوں میں سکیڑ لیا۔ اُس کا سر اس کے بازوؤں میں دبا ہوا تھا۔ اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی مگر اس کی آنکھ پھر لگ گئی۔

"او باکھیا، او باکھیا، او بھنگی کی شیطانی اولاد۔ ابے چل اور میرے لیے ایک ٹٹی صاف کر،" کوئی باہر سے چلایا۔

باکھا نے اپنے جسم پر سے کمبل اتار کر پھینک دیا۔ اس نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے چمٹی آدھی نیند کو اتارنے کے لیے اپنی ٹانگیں اور ہاتھ ہلائے اور جماہی لیتا ہوا اور آنکھیں ملتا ہوا ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ جھکا اور دن بھر کے لیے کمرے کو ٹھیک کرنے کے لیے اپنی دری اور کمبل کو لپیٹ کر رکھنے لگا۔ اسے یہ خیال ہوا کہ وہ آدمی پھر باہر چلا رہا ہے اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

ایک چھوٹا سا پتلا آدمی جس نے ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں پہنا ہوا تھا باہر اپنے بائیں ہاتھ میں ایک پیتل کا لوٹا لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر کھال سے چپکی ہوئی ایک سفید گول سوتی ٹوپی تھی، پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں تھی اور اُس نے اپنی لنگوٹی کا ایک سرا اٹھا کر ناک پر رکھا ہوا تھا۔

یہ حوالدار چرت سنگھ تھا، ۳۸ ڈوگرہ رجمنٹ کا مشہور ہاکی کھلاڑی۔ وہ اپنی مزاقیہ طبیعت کے لیے مشہور تھا اور اپنی بواسیر کی بیماری کے لیے جسے وہ مخصوص ہندوستانی صاف گوئی سے تسلیم کرتا تھا کہ بھئی میں تو اِس کا پرانا مریض ہوں۔

"او باکھے بدمعاش ابھی تک ٹٹیاں کیوں صاف نہیں ہوئیں۔ ایک بھی اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اُس کے پاس بھی چلا جائے۔ میں نے سارے میں گھوم کر دیکھ لیا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ تو ہی میری بواسیر کے لیے ذمے دار ہے؟ مجھے یہ بیماری ایک گندی ٹٹی پر بیٹھ کر لگی ہے۔"

"ٹھیک ہے حوالدار جی۔ میں فوراً ایک ٹٹی آپ کے لیے تیار کر دوں گا،" باکھا نے محتاط ہو کر کہا اور اپنی جھاڑو اور ٹوکری اس جگہ سے اٹھانے کے لیے بڑھا جہاں وہ گھر کے باہر کی دیوار پر رکھی رہتی تھیں۔

وہ بڑی ایمانداری سے اور بغیر وقت کھوئے جلدی سے کام کرلیتا تھا۔ وہ تیز رفتار تھا مگر سنبھل کر کام کرتا تھا۔ اور اس کی اپنے کام کو جی لگا کر کرنے کی قوت اس طرح سے اس کے اندر سے باہر آئی تھی جیسے کسی قدرتی چشمے میں سے پانی نکل کر بہتا ہے۔ اُس کے جسم کے اندرونی نہاں خانوں میں اُس کی قوت اور ذرائع کے بہت زیادہ ذخیرے رہے ہوں گے کیونکہ وہ انتہائی چستی، ہوشیاری اور تیزی سے بغیر دروازے والی ٹٹی کو پانی ڈال کر جھاڑو سے صاف کرتا اور فنائل ڈالتا اور دوسری ٹٹی کی طرف بڑھ جاتا، اتنی آسانی سے جیسے کسی گہرے دریا کی سطح پر کوئی لہر اچھلتی کودتی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ وہ جب کام کرتا تو اس کے جسم کا عضو عضو جو چٹان کی مانند سخت تھا، شیشے کی طرح چمکتا تھا۔ "کتنا ہوشیار اور محنتی کام کرنے والا ہے" کوئی بھی دیکھنے والا کہہ سکتا تھا۔ اور اگرچہ اُس کا کام گندا تھا، وہ مقابلتہً صاف رہتا تھا۔ کموڈوں پر کام کرتے ہوئے اور انھیں صاف کرتے ہوئے بھی وہ اپنی باہوں تک کو گندا نہیں ہونے دیتا تھا "اپنے کام کے لیے وہ زیادہ بڑھیا آدمی ہے" سب لوگ ہمیشہ کہا کرتے "اِس قسم کا آدمی نہیں ہے جو یہ کام کرے" کیونکہ وہ عقلمند اور حساس نظر آتا تھا اور اُس میں ایک ایسا امتیاز تھا جو ایک عام بھنگی میں نہیں ہوتا جو گندا رہتا ہے اور عام طور پر اُجڈ ہوتا ہے۔ شاید یہ اس کا اپنے کام میں انہماک تھا جو اسے دوسرے بھنگیوں سے ممتاز کرتا تھا، یا اِس کی وجہ ولایتی پوشاک تھی، چاہے وہ کتنی ہی ڈھیلی اور اس کے ناپ کی نہ ہو، جو اسے اپنی بدبودار دنیا سے الگ کر دیتی تھی۔ حوالدار چرت سنگھ جس میں بے عیب صفائی کا ہندوانہ جذبہ تھا، بڑا حیران ہوا جب وہ ٹٹی میں سے اپنے تکلیف وہ آدھ گھنٹے کے بعد نکلا اور اُس کی نظر باکھا پر پڑی۔ یہ نچلی ذات کا ایک آدمی اتنا صاف تھا! اسے خود اپنا احساس ہوگیا اور دوبارہ[۵] پیدا ہوئے اونچی ذات کے ہندو کا بدبو کے خلاف تعصب اُس کے ذہن میں ابھر آیا۔

---

[۵] ہندو سماج میں، دو اونچی ذاتوں کے لوگ، برہمن اور کشتری اس بات پر زور دے کر اپنی برتری ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے اعلیٰ ذات کا یہ مرتبہ پچھلے متعدد جنموں میں اچھے کرموں کی بنا پر حاصل کیا ہے۔

اگرچہ باکھا میں اِس کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں نظر آیا، وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔ پھر وہ اپنی اونچی ذات کو بھول گیا اور اس کے چہرے کی طنز آمیز مسکراہٹ ایک بچوں کی سی ہنسی میں بدل گئی۔

"اوئے باکھیا، تو، تو ایک جنٹلمین، ہوتا جا رہا ہے۔ تو نے یہ وردی کہاں سے لی؟"

باکھا شرمندہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اونچی ذات کے لوگوں کی ریس کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔

"حضور یہ سب آپ کی دعا ہے۔"

چرت سنگھ کچھ ہمدردی محسوس کر رہا تھا، اگرچہ اس نے اپنی مسکراہٹ کو کم نہیں کیا جو چھ ہزار سال کی ذات اور طبقے کی برتری کا نمایاں نشان تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کے لیے کہا۔

"باکھے آج دوپہر کو آئیو۔ میں تجھے ایک ہاکی دوں گا"

باکھا نے اپنے آپ کو ذرا سیدھا کیا۔ وہ چرت سنگھ کی پیش کش پر بڑا حیران تھا، لیکن ساتھ ہی اس کا شکر گزار بھی۔ رجمنٹ کے بہترین ہاکی کے کھلاڑی کی طرف سے اپنے آپ کی ہوئی یہ پیش کش اسے ایسی لگی جیسے پرماتما کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ "ہاکی! پتہ نہیں اگر وہ نئی ہوگی۔" اس نے اپنے دل میں سوچا اور وہ بڑی عاجزی سے جذبۂ احسان مندی میں مسکراتا رہا۔ چرت سنگھ کے فراخدلانہ وعدے نے باکھا کے اندر خدمت گزاری اور بندگی کا وہ جذبہ ابھار دیا تھا جو ورثے میں اسے اپنے بزرگوں سے ملا تھا، جو پچھڑے ہوئے لوگوں کی کمزوری تھی، غریبوں اور ناداروں کی بے چارگی، کوئی مدد مل جانے پر خوشی اور نچلے طبقے کی وہ خاموش قناعت جو اچانک کسی پرانی خواہش کی تکمیل یا راز کو پا لینے پر حاصل ہوتی ہے۔ اس نے اپنے محسن کو سلام کیا اور اپنے کام پر پھر لگ گیا۔

ایک نرم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر قائم رہی، ایک ایسے غلام کی مسکراہٹ جو اپنے آقا کی مہربانی پر خوشی سے پھولا نہیں سماتا، جو خوشی کے مقابلے میں فخر سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اور اس نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کر دیا۔ ایک ٹٹی سے دوسری ٹٹی

تک وہ اپنا جسم لہرا کر لے جاتا اور اِس سے اس کا ہلکی آواز میں گنگنانا بھی خاصہ اونچا گیت بن جاتا تھا۔ اور وہ آگے بڑھتا رہا، ایک کام سے دوسرے کام کی طرف، اور یہ ایک تعجب خیز حرکت تھی جسے کام کے ذریعے رقص سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ ہاں اُس کے جسم کی حرکت قدرے اتنی تیز ہوتی کہ ایک دفعہ تو اس کی پگڑی کے بل کھل جاتے اور اس کے اوور کوٹ کے بٹن اپنے گھسے ہوئے کاجوں میں سے نکل جاتے۔ لیکن اس سے اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ پڑتی۔ وہ بھدے طریقے سے اپنے ڈھیلے کپڑوں کو سمیٹ لیتا اور کام کرتا رہتا۔

ٹٹیوں کی طرف آدمی ایک دوسرے کے بعد آتے رہتے۔ اِن میں سب سے زیادہ ہندو ہوتے، ننگے، صرف ایک لنگوٹی یا دھوتی پہنے، ہاتھوں میں پیتل کے لوٹے لیے ہوئے اور جنیئو کو موڑ کر اپنے بائیں کانوں کے گرد لپیٹے ہوئے۔ کبھی کبھی کوئی مسلمان آجاتا جو لمبا سفید سوتی کرتا اور ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوتا اور اس کے ہاتھ میں تانبے کا کوئی بدھنا یا لوٹا ہوتا۔

باکھانے کام کا اپنا مترنم تسلسل توڑ دیا اور اپنی باہنہ سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اسے اس کا اونی کپڑا اپنی کھال پر بڑا اچھا لگا اگرچہ اُس میں ذرا سی چبھن تھی۔ بعد میں اسے اس کی رگڑ سے ایک ناخوشگوار جلن سی محسوس ہوئی، ایک گرمی سی جو بعد میں اسے اچھی لگی اور وہ نئے جوش کے ساتھ، جو عموماً آرام بدن میں پیدا کر دیتا ہے، اپنے کام پر لگ گیا۔ ”میرا کام اب جلدی ختم ہو جائے گا“ اس نے اپنے آپ سے کہا جب وہ اپنے کام کے پہلے دَور کے آخر میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن ایک کام کے ختم ہونے کا مطلب اس کے لیے عیش و آرام نہیں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ کام سے جی چراتا تھا یا خالی بیٹھے رہنا اسے پسند تھا۔ اس کے لیے کام، اگرچہ اسے اس کا علم نہیں تھا، ایک نشہ سا تھا جو اس کی صحت کو عمدہ بنا کر اسے آسانی سے گہری نیند عطا کرتا تھا۔ اس لیے وہ لگاتار کام کرتا رہتا تھا، بغیر رُکے؛ حتیٰ کہ وہ سانس لینے کے لیے بھی نہیں رکتا تھا اگرچہ اس کے جسم کی لگاتار تیز حرکت سے اس کا سانس پھول جاتا تھا۔

آخر کار جب وہ اپنے صبح کے کام پر دوسری دفعہ ٹٹیوں کی تیسری لائن کے آخر میں پہنچ گیا تو اس کی کمر میں درد ہونے لگا۔ وہ سویرے سے جھکا جھکا کام کر رہا تھا

اور اس نے اپنے آپ کو سیدھا کیا۔ اس نے شہر کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ہلکا، دھندلا سا غبار تھا، ایک قسم کا پردہ جسے چمنی میں سلگتی ہوئی آگ نے جہاں اُس نے کل رات گندگی جلائی تھی، غبار کے تیرتے ہوئے بادلوں کے ساتھ مل کر پیدا کر دیا تھا جو ندی کی سطح سے اٹھ کر بنتے رہتے تھے۔ اس پتلی سی تہہ کے پیچھے وہ ہندوؤں کے ادھ ننگے جسموں کو تیزی سے ٹنٹیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اُن میں سے کچھ جو پہلے ہی فارغ ہو چکے تھے اپنے چھوٹے چھوٹے پیتل کے لوٹوں کو ندی پر مٹی سے رگڑ کر صاف کرتے دیکھے جا سکتے تھے۔ دوسرے "رام رے رام" اور "ہری رام" کی دُھن گا کر نہا رہے تھے یا پانی میں جھک کر اپنے ہاتھ تھوڑی سی نرم مٹی سے صاف کر رہے تھے، اپنے پاؤں اور چہرے دھو رہے تھے اور داتنون کو دانتوں سے کاٹ کر برش کی شکل میں بنا کر دانت صاف کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ منہ سے کلّی بھی کر رہے تھے، حلق صاف کر رہے تھے اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ندی میں تھوکتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ناک پر پانی ڈال کر اسے بھی شور مچا کر صاف کر رہے تھے۔ جب سے وہ برٹش بارکوں میں کام کرنے لگا تھا، باکھا کو ان ہندوستانی غسل کرنے اور صفائی کرنے کے طریقوں پر بڑی شرم آتی تھی یعنی وہ گلا صاف کرنا اور تھوکنا۔ وہ جانتا تھے کہ ٹامی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اسے ٹامیوں کی وہ جانی پہچانی گالی یاد آ گئی جو وہ ہندوستانیوں کو دیتے تھے۔ "کالا آدمی، زمین پر ہگنے والا"۔ لیکن باکھا کو اس منظر پر بھی شرم آتی تھی جب ٹامی بالکل ننگے دوڑتے ہوئے اپنے نہانے والے ٹب کی طرف جاتے تھے۔ "شرمناک" اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ لیکن وہ تو صاحب لوگ تھے۔ جو کچھ وہ کرتے تھے "فیشن" تھا۔ لیکن اس کے اپنے ہم وطن وہ تو "کالا لوگ" تھے۔ وہ کسی انگریز کی مانند محظوظ ہوتا جب وہ کسی ہندو کو اپنی دھوتی یا لنگوٹی کھول کر اپنے پیٹ پر اور پھر اپنی پیٹھ کے نیچے پانی ڈالتے اور تیزی سے بھجن گاتے دیکھتا۔ اسی طرح وہ حقارت آمیز لطف سے کسی مسلمان کا یہ غیر مہذبانہ فعل بھی دیکھتا کہ وہ مسجد جانے سے پہلے رسماً اپنے آپ کو پاک کرنے کے لیے اپنے پاجامے میں ہاتھوں کو اندر تک ڈالے جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا "پتہ نہیں یہ لوگ اپنی نماز میں

کیا کہتے ہیں؟ یہ بیٹھنے، اٹھنے، جھکنے اور دوزانو کیوں ہوتے ہیں جیسے کوئی ورزش کررہے ہوں؟" ایک دفعہ، اسے یاد آیا، کہ اس نے علی سے پوچھا تھا، جو رجمنٹ میں ایک بینڈ والے کا بیٹا تھا، کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں لیکن علی کچھ بھی نہیں بتا سکا بلکہ اس پر ناراض ہوگیا کہ باکھا اس کے مذہب کی بےعزتی کر رہا تھا۔ اور پھر اسے وہ ہر روز کا منظر بھی یاد آیا جب صبح سویرے ننگے ہندو مرد اور عورتیں شہر کے باہر کھلے میدان میں رفع حاجت کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ "کتنی بےشرمی کی بات ہے" اس نے سوچا "وہ اس بات کی پروا بھی نہیں کرتے کہ انھیں اِس بےشرمی کی حالت میں کوئی دیکھتا ہے کہ نہیں۔ اِسی بات کی وجہ سے گورے اِنھیں کہتے ہیں "کالا لوگ زمین پر ہگنے والا"۔ وہ اِن ٹٹیوں میں کیوں نہیں آتے؟" لیکن، پھر اس نے احساس کیا، اگر وہ ٹٹیوں میں آئیں گے تو اس کا کام بڑھ جائے گا اور اسے یہ خیال پسند نہیں آیا۔ اُس نے اِس بات کو ترجیح دی کہ وہ اپنے باپ کی بجائے سڑکوں پر جھاڑو دے گا۔ "وہ آسان کام ہے" اس نے اپنے آپ سے کہا "مجھے صرف پہلے سے گوبر اور لید اٹھانی پڑے گی اور جھاڑو سے سڑکوں کو بہارنا ہوگا"

"ایک بھی ٹٹی صاف نہیں ہے۔ تو تنخواہ لیتا ہے تو کام کیوں نہیں کرتا؟"

باکھا نے ایک دم مڑکر دیکھا اور سیاہ فام چڑچڑے مزاج والے راما نند کو پایا جو روپے سود پر دیتا تھا۔ وہ اپنے تیز دکھنی لہجے میں اس پر چلا رہا تھا۔ اس نے راما نند کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سر ہلا دیا۔ راما نند اس کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں لعل جڑی سونے کی بالیاں لٹک رہی تھیں اور اس نے ململ کی باریک دھوتی اور ململ کا ہی کرتا اپنی توند پر پہنا ہوا تھا اور ایک عجیب سی رسّی کی ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ "مہاراج" باکھا نے کہا اور ٹٹیوں کی طرف دوڑا اور پھر کام میں لگ گیا۔

باکھا کو اس کا احساس تک نہیں تھا کہ اس نے اپنے کام میں کوتاہی کی تھی اور وہ بُری طرح کام میں جٹ گیا۔ اس چوتھائی گھنٹے کا جو اس نے ٹٹیوں کو چوتھی دفعہ صاف کرنے میں لیا، اس کو پتہ تک نہیں لگا۔ دراصل نہ اسے وقت کا احساس تھا، نہ اس کی پیشانی سے ٹپکتے ہوئے پسینے کا، نہ اپنے بدن میں گرمی اور راحت کا جو

کام ختم ہونے کے بعد اس میں آگئی تھی۔

اس کے گھر کے نزدیک چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں نے اسے اس بات کا احساس دلا دیا کہ اس کا اگلا کام کیا ہوگا۔ وہ اُس کی طرف بے دلی سے بڑھا اور کچھ دیر رکنے کے بعد اس نے ایک ترشول کی شکل کا بیلچہ اٹھایا اور اینٹوں کی بنی چمنی کے کھلے دہانے میں میلے سے بھری برادے اور تنکوں سے ڈھکی ٹوکریوں کو جو وہ ٹٹیوں پر سے لایا تھا ان میں جھونکنے لگا۔

جیسے ہی باکھا گندگی چمنی میں ڈالتا، چھوٹے چھوٹے تنکے اور برادہ ہوا میں اڑتا اور باریک ذرّے تو اس کے کپڑوں پر پڑ جاتے اور بڑے ٹکڑے زمین پر گر پڑتے جہاں سے پھر وہ انھیں جھاڑو سے صاف کرتا۔ لیکن وہ بغیر کسی بات کا احساس کیے کام کرتا رہتا۔ یہ غائب دماغی اور خالی پن اس کے اندر لمبے لمبے وقت تک رہتا۔ یہ ایک قسم کی بے حسی تھی جو اس کے اندر اس کے کام نے پیدا کر دی تھی، جو اس کا پیشہ تھا۔ سخت کھال تو گندے سے گندے احساسات کے خلاف ڈھال کا کام دیتی ہے۔ میلے سے بھری اور خس و خاشاک سے ڈھکی ٹوکریوں میں سے بار بار جھک کر وہ اپنا بیلچہ بھر دیتا اور چمنی میں ڈال دیتا حتیٰ کہ لوہے کی کھڑکی کے پرے اوپر تک اتنا بھر جاتا کہ مزید ڈالنے کی گنجائش نہ رہتی۔ پھر وہ ایک بانس اٹھاتا اور اسے گھسیڑ کر دبی ہوئی آگ کو ابھارتا۔ آگ تیزی سے بھڑک اٹھتی اور چمنی کی بھٹی میں سرخ، سنہری اور سیاہ شعلے بھڑکتے اور اسے روشن کر دیتے۔ غیض و غضب والے یہ شعلے جلا کر راکھ کرنے والی ایک بڑی طاقت تھی اور یہ طاقت برادے اور تنکوں کے ڈھیروں سے جن سے وہ بھڑکتی تھی، بڑی مختلف اور الگ تھی۔

باکھا ان شعلوں کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے خون کی شریانوں میں ایک حرارت پیدا ہوئی۔ اس کا سیاہ چہرہ، گول، ٹھوس اور نمایاں خد و خال والا، ایک عجیب خوبصورتی سے دمکنے لگا۔ دن بھر کی روزانہ مشقت نے اسے ایک عمدہ جسم عطا کیا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ٹھیک بھی تھی۔ اس کے جسم میں اعضا کی عمدگی اور ایک اعلیٰ یکسانیت اور ہمواری تھی اور کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا: ’’یہ ہے آدمی!‘‘ اور یہ سن کر اس کی شخصیت میں ایک امتیاز پیدا ہو جاتا اور یہ ایک

عجیب و غریب تضاد تھا، اس کے گندے پیشے سے اور انسان سے بھی نچلے اس مرتبے سے جو پیدائش سے ہی اس کے نصیب میں آیا تھا۔

یہ کام کافی لمبا تھا اور تقریباً بیس منٹ تک چلا۔ لیکن باکھا کو ظاہرہ طور پر کوئی تھکاوٹ نہیں محسوس ہوئی، جیسا کہ اس نے اس سے پہلے کے کام میں محسوس کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جلتے ہوئے شعلے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ لاجواب جذبہ بھر رہے تھے جو قربانی سے کافی ملتا جلتا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا جلانا اور تباہ کرنا اس کے لیے جسمانی یا فطرتی تمدن کی ایک شکل تھی۔

اب چمنی میں میلے اور خس و خاشاک کی آخری ٹوکری جل گئی تھی۔ باکھا نے اپنا منہ ڈھک لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اسے پیاس لگی اور اس کے ہونٹوں کے کنارے خشک تھے۔ اس نے اپنا بیلچہ، ٹوکری، جھاڑو اور برش واپس اپنی جگہ پر رکھ دئے۔ پھر وہ چمنی کے دھوئیں سے بھری ہوا کو سونگھتا ہوا اور اپنے کپڑوں کو ہاتھ سے جھاڑتا اور ٹھیک کرتا ہوا اپنی جھونپڑی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی پیاس بے حد بڑھ گئی۔ اُس نے سکتے کے سے عالم میں بکھرے ہوئے برتنوں کو دیکھا اور اسے شدّت سے چائے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے کمرے کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کا باپ تو ابھی تک اپنے پیوند لگے لحاف کے نیچے خرآٹے لے رہا تھا۔ اس کا بھائی کمرے میں نہیں تھا۔ اسے فوراً پتہ لگ گیا کہ وہ کہاں ہوگا۔ سڑک کے پاس میدان میں کھیل رہا ہوگا! جب وہ کھڑا ہوا چاروں طرف اپنے کمرے میں دیکھ رہا تھا تاکہ اِس کے اندر پھیلے ہوئے اندھیرے کا عادی ہو جائے تو اس نے دیکھا کہ اس کی بہن دو اینٹوں کے درمیان آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چولہے میں زور زور سے پھونکیں مار رہی تھی اور کچّے فرش پر جھک جھک کر اپنے آپ کو کہنیوں پر ٹکا رہی تھی۔ اُس کا سر زمین سے تقریباً چھو جاتا تھا لیکن اس کی ہر پھونک صرف زیادہ دھواں اٹھا رہی تھی۔ گیلی لکڑیوں کی وجہ سے آگ نہیں جل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے بھائی کے قدموں کی آواز سنی تو مجبور سی ہو کر بیٹھ گئی۔ دھواں اس کی آنکھوں میں گھس گیا اور اُن میں پانی بھر گیا تھا۔ اس نے مڑکر اپنے بھائی کو دیکھا اور اس کے گالوں پر اس کے آنسو ڈھلک پڑے۔

"تو اُٹھ اور مجھے پھونکیں مارنے دے" باکھا بولا اور جواب کی انتظار کیے بغیر وہ کمرے کے کونے کی طرف بڑھا، گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھا، اس نے لکڑیوں کو ہاتھ سے ہلایا جلایا اور سر جھکا کر پھونکیں مارنے لگا۔ اس کا بڑا منہ ایک اصل دھونکنی لگ رہا تھا جس میں سے نکل کر اس کا سانس ہوا کی سی آواز کے ساتھ چولہے میں جا رہا تھا۔ پہلے کچھ چنگاریاں پیدا ہوئیں، پھر گیلی لکڑیوں میں سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس نے مٹی کی ہنڈیا چولہے پر رکھ دی۔

"ہنڈیا میں پانی نہیں ہے۔" اس کی بہن بولی۔

"میں گھڑے میں سے پانی لے لوں گا۔" باکھا بولا اور کونے کی طرف بڑھا۔

"گھڑے میں بھی پانی نہیں ہے۔" وہ بولی

"اوہو" باکھا نے آہ بھر کر کہا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور جھنجلا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ہارا تھکا گھڑے کے پاس کھڑا رہا جس پر وہ پانی کے لیے جھک گیا تھا۔

"میں جاکر پانی لے آتی ہوں" سوہنی آہستے سے بولی

"ٹھیک ہے" باکھا نے تکلف نہ برتتے ہوئے کہا اور باہر جاکر ایک ٹوٹی ہوئی بید کی کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ یوروپین فرنیچر میں صرف یہی ایک کرسی تھی جو باکھا نے انگریزوں کی طرح رہنے کی آرزو میں حاصل کرلی تھی۔ سوہنی نے گھڑا اٹھایا، اسے آسانی سے سر پر ٹکا لیا اور اپنے بھائی کے پاس سے تیزی سے گزر گئی۔

ایک گول سطح پر ایک گول شے کیسے ٹکی رہتی ہے یا ایک کرہ دوسرے کرے پر کیسے ٹھہر سکتا ہے، یہ مسئلہ تو اُن لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے جو اقلیدس یا ارشمیدس کی طرح سوچتے ہیں۔ سوہنی کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کی کبھی نہیں سوجھی اور وہ گھڑا اپنے سر پر ٹکائے اپنے ایک کمرے کے گھر سے اونچی ذات والوں کے کوئیں کی سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گئی اور اس امید میں کھڑی ہوگئی کہ کوئی شریف آدمی شاید اس پر رحم کھا کر کنویں میں سے پانی نکال کر اس کے گھڑے میں ڈال دے گا۔ سوہنی کا بدن کسی پری کی طرح تھا، پتلا نہیں بلکہ اپنے شاندار قدوقامت سے مطابقت رکھتا ہوا بھرپور اور بھرا ہوا، کولہوں پر سے اچھی طرح

گول اور کمان کی طرح تنگ کمر جس کے نیچے سے اس کے پاجامے کی تہیں اترتی تھیں اور اس کے اوپر اس کی پوری ابھری ہوئی گول گول چھاتیاں تھیں جو انگیا نہ ہونے کے سبب اس کے ململ کے پہن کرتے کے نیچے تھوڑی تھوڑی ہلتی رہتی تھیں۔ جب وہ جھول کر باکھا کے پاس سے گزری تھی تو باکھا نے بھی اسے دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت تھی۔ باکھا کو اس پر فخر تھا مگر یہ جذبہ پورے طور پر ایسا نہیں تھا جو ایک بھائی کے دل میں بہن کے لیے ہوتا ہے۔

ذات سے خارج لوگوں کو کوئیں کے چاروں طرف بنے ہوئے چبوترے پر چڑھنا منع تھا کیونکہ اگر انھوں نے کبھی اِس میں سے پانی نکال لیا تو تین اونچی ذاتوں کے ہندو سارے پانی کو بھرشٹ یعنی ناپاک سمجھیں گے۔ نہ ہی انھیں ندی کے پاس جانے کی اجازت تھی کیونکہ اُن کے ندی کو استعمال کرنے سے ندی کا پانی بھی بھرشٹ ہو جائے گا۔ اُن کا اپنا کنواں بھی کوئی نہیں تھا کیونکہ بلا شاہ جیسے پہاڑی شہر میں کوئیں کھودنے کا خرچہ کم سے کم ایک ہزار روپے تھا۔ اِس لیے انھیں مجبوراً اونچی ذات کے لوگوں کے کوئیں کے نیچے اکٹھا ہونا پڑتا تھا جہاں وہ اس انتظار میں رہتے کہ شاید اونچی ذات کا کوئی ہندو ترس کھا کر پانی اُن کے گھڑوں میں ڈال دے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اونچی ذات کا کوئی آدمی کوئیں پر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سب لوگ پیسے والے تھے اور انھوں نے کہار لگا رکھے تھے جو ہر صبح ان کے غسل خانوں اور رسوئی کے لیے بہت سا تازہ پانی بھر کر دے آتے تھے۔ صرف وہی لوگ کوئیں پر آتے تھے جو یا تو کھلی ہوا میں نہانے کے شوقین تھے یا کہاروں کو لگانے کی توفیق نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے نچلی ذات کے لوگوں کو تو صرف انتظار کرنا پڑتا تھا کہ شاید ایسا اتفاق ہو جائے کہ اونچی ذات کا کوئی آدمی کوئیں پر آ جائے اور ان کی قسمت سے اس کے پاس اتنا وقت ہو کہ اُن کے گھڑے پانی سے بھر دے۔

وہ ہر صبح، دوپہر اور شام کو کوئیں کے گرد بھیڑ کر کے اکٹھے ہو جاتے اور اینٹوں کے بنے اونچے چبوترے کے نیچے کی ساری جگہ گھر جاتی۔ وہ غلامانہ عجز کے ساتھ ہر کسی کے سامنے ہاتھ جوڑتے اور اگر کوئی انکار کر دیتا تو وہ اپنے آپ کو ہی برا بھلا کہتے اور اپنی قسمت کو کوستے۔ ساتھ ساتھ یہ دعا کرتے کہ پرماتما کسی نیک آدمی کو

بھیج دے جوان کی بات سن کر اُن کی مدد کر دے۔

جب سوہنی کوئیں پر پہنچی تو وہاں دس کے قریب اور نچلی ذات کے آدمی انتظار کر رہے تھے لیکن انھیں پانی دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کوئیں پر تیز تیز چل کر آئی تھی اور اس کے دل میں بڑا فکر اور ڈر تھا کہ اسے اپنی باری کے لیے کافی انتظار کرنا ہوگا کیونکہ اس نے دور سے ہی اس انتظار کرتی ہوئی بھیڑ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور جب وہ گھر سے چلی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک ماں تھی اور گھر سے اپنے عزیزوں کے لیے پانی لینے نکلی تھی، بالکل اسی ماں کی طرح جو گھر سے سب کے لیے خوراک اور پانی لینے باہر جاتی ہے۔ اور جب وہ اپنے تکلیف اٹھانے والے ساتھیوں کے ساتھ ایک قطار میں بیٹھی ہوئی تھی تو اسی کا دل ڈوب گیا۔ کسی بھی ایسے آدمی کے گزرنے کے کوئی آثار نہیں تھے جو ان پر یہ احسان کر دیتا۔ لیکن سوہنی صبر کی پتلی بنی بیٹھی رہی۔ اُس میں قدرتی طور پر صبر اور برداشت کا مادہ تھا جو اِس وقت جب وہ شانتی اور صبر کی مورتی بنی ہوئی تھی اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔

گلّا بو دھوبن نے جو اس کے بھائی کے دوست رام چرن کی ماں تھی سوہنی کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ دودھیا رنگ کی متوسط عمر کی عورت تھی اور اُس کی اِس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی اس کے خوشنما گداز جسم کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اپنی جوانی میں غضب کی ہوگی۔ اگرچہ اس کے چہرے پر اب جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو اب بھی حسین سمجھتی تھی اور اس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ بڑھیا آفت کی پرکالہ اپنے آپ کو دوسری نچلی ذاتوں کے لوگوں سے افضل سمجھتی تھی۔ اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ نچلی ذاتوں میں بھی وہ اپنے آپ کو اونچے مرتبے کا مانتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ شہر کا ایک باعزت ہندو جو اس کی جوانی میں اس سے عشق کرتا رہا تھا، اِس عمر میں بھی اس پر کافی مہربان تھا۔

سوہنی چونکہ نچلی ذاتوں میں بھی سب سے نچلی ذات کی تھی اس لیے گلّا بو اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ گلّا بو کو اِس بات پر اور بھی زیادہ غصہ تھا کہ سوہنی کتنی خوبصورت نکلتی آ رہی تھی اور وہ اس کی رقیب بن سکتی تھی۔ وہ سوہنی کے

معصوم بچوں کی طرح کے چہرے کو دیکھتے ہی اُس سے نفرت کرنے لگتی تھی اگرچہ وہ کبھی اِس بات کا اعتراف نہیں کرتی تھی کہ وہ بھنگی لڑکی سے جلتی تھی۔ لیکن جب کبھی وہ سوہنی کا مذاق اڑاتی یا مذاق میں اسے گالیاں دیتی تو اس کا حسد کا جذبہ چھپا نہ رہتا۔ سوہنی اس احساس میں جو اس کی خوبصورتی کے بارے میں دوسروں کی تعریفیں اس میں جگا دیتیں، یہ سب مذاق اور گالیاں سہہ لیتی۔

"جا گھر لوٹ جا" گلابو اُس کا مذاق اڑاتی ہوئی بولی "یہاں تجھے کوئی پانی دینے والا نہیں۔ اور تیرے سے پہلے ہی کتنے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

سوہنی لاپروائی سے مسکرا دی۔ پھر اُس نے بھیڑ میں ایک بزرگ آدمی کو پہچان لیا اور شرم سے اس نے اپنا پلو سر سے آنکھوں تک کھینچ لیا اور وہ اپنے گھڑے پر جھکی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"کبھی تم لوگوں نے ایسی بے شرمی دیکھی" گلابو نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی جلاہے کی بیوی وزیرو سے کہا "یہ بھنگی لڑکی سارے شہر اور چھاؤنی میں سر کھلے گھومتی رہتی ہے!"

"سچ؟" وزیرو ایسے بن کر بولی جیسے اسے بڑا اچنبھا ہوا ہو اگرچہ سوہنی کے خلاف اس کے دل میں کچھ نہیں تھا اور وہ جانتی تھی کہ گلابو کتنی بد زبان ہے "تجھے شرم آنی چاہیئے" اور ساتھ ہی اس نے سوہنی کو آنکھ مار دی۔

سوہنی وزیرو کے دوستی جتانے کے اس طریقے پر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور ہنس پڑی۔

"ذرا سوچ، ذرا سوچ، اری کتیا۔ تو تو رنڈی ہے۔ چھنال کہیں کی۔ تیری ماں کو مرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ تو میرے منہ پر ہنستی ہے اور میرا مذاق اڑاتی ہے جو تیری ماں کے برابر ہے۔ کتی؟" دھوبن پھٹ پڑی۔

سوہنی گلابو کی اِس گالیوں کی بوچھاڑ پر اور بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اری او کتیا۔ کیا تو مجھے مسخری سمجھتی ہے؟ چھنال تو ہنس کس بات پر رہی ہے؟ اری او رنڈی کیا تجھے مردوں کے سامنے مجھے اپنے دانت دکھاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" گلابو چلائی اور اس نے اس بوڑھے آدمی کی طرف دیکھا اور اُن چھوٹے لڑکوں کی

طرف جو آس پاس بیٹھے ہوتے تھے۔

سوہنی کو اب محسوس ہوا کہ یہ عورت تو واقعی ناراض ہے۔ "لیکن میں نے اُسے ناراض کرنے کی کوئی بھی بات نہیں کی" اُس نے دل میں سوچا "اس نے خود بولنا شروع کیا اور اب مجھے بری طرح گالیاں دے رہی ہے۔ میں نے تو اِس سے جھگڑا نہیں کیا۔ ناراض ہونے کی وجہ تو میرے پاس ہے نہ کہ اس کے پاس۔"

"کُتیا بولتی کیوں نہیں۔ رنڈی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟" گلابو اڑی رہی۔

"دیکھ مجھے گالی مت دے" لڑکی بولی "میں نے تجھے کچھ نہیں کہا ہے۔"

"تو چپ رہ کر مجھے غصہ دلا رہی ہے، حرام کی جنی۔ گُو کھانے والی اور موت پینے والی بھنگن کتی۔ میں تجھے بتاتی ہوں کہ اپنی ماں کے برابر کی عورت کی بے عزتی کیسے کرتے ہیں۔" اور وہ اٹھی اور ہاتھ اٹھا کر سوہنی کی طرف لپکی۔

اس سے پہلے کہ وہ سوہنی کو مارے، جُبلا سے کی بیوی وزیرو اُٹھی اور اس نے دوڑ کر گلابو کو پکڑ لیا۔

"ٹھنڈی ہو جا، ٹھنڈی ہو جا" وہ گلابو کو کھینچ کر اس کی جگہ پر لاتی ہوئی بولی "نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

اِس چھوٹی سی بھیڑ میں اِس سرے سے اُس سرے تک جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ چلّانے لگے اور چیخ و پکار اور "ہائے ہائے" کی آوازیں آنے لگیں۔ سب ایک دوسرے کی طرف ناپسندیدگی، نارافگی اور غصے کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سوہنی پہلے تو کچھ ڈری اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ لیکن وہ بالکل خاموش بیٹھی رہی اور اس واقعے کی پریشانی سے بچتے ہوتے وہ ایک بے دلی کی سی کیفیت میں اتر گئی۔ لیکن جب اُس نے نگاہیں پرے کیں اور اوپر نیلے آسمان کی طرف جھانکا تو اس نے ایک قسم کی بے چینی اور ایک درد کا احساس کیا اور اگرچہ اس نے اِسے ایک بے چارگی سے قبول کر لیا، اِس سے اس کے دل کو ایک چوٹ سی لگی۔ اداس ہو کر اس نے ایک آہ بھری اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل میں کوئی چیز رحم کی طلب گار ہے۔ اوپر سے آفتاب اپنی گرم شعاعیں پھینک رہا تھا جس سے وقت گزرنے کا احساس پیدا ہوا

جس نے گلابو کے ساتھ بن بلائے جھگڑے کو بھی بھلا دیا لیکن ساتھ ہی اس کے ذہن میں اس کے بھائی کی گھر پر اس کی انتظار کرنے کی اداس اور بھیانک تصویر بھی ابھار دی۔ وہ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد پیاسا تھا اور چائے کے ایک پیالے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اور اِدھر اونچی ذات کا کوئی ہندو آتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

خاموشی میں کئی منٹ گزر گئے۔ صرف گلابو کی سسکیاں اور آہیں اِس سکوت میں ہلکا سا خلل ڈال رہی تھیں ــ "میری چھوٹی لڑکی کی شادی کے دن ہی ایسا ہونا تھا۔ اِس منحوس بھنگن نے میرا یہ شُبھ دن کتنی بری طرح شروع کیا" وہ کہہ رہی تھی لیکن اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا۔ اور پھر آخر کار دیر سے ٹٹّی جانے والا ایک اونچی ذات کا ہندو اُدھر سے گزرا۔ وہ پاس کی رجمنٹ کا ایک سپاہی تھا۔

" او مہاراج، او مہاراج، دَیا کرنا، ہمارے لیے تھوڑا سا پانی کھینچ دو۔ ہم تمہارے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ہم یہاں بڑی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا"۔ سب اس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک ہی آواز میں چلائے۔ کچھ کھڑے ہوئے تھے اور کچھ جھک کر اپنی ہتھیلیوں کو ایسے جوڑے ہوئے تھے جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔ کچھ بیٹھے ہوئے ایسے ہی اپنے ہونٹوں کو طرح طرح سے مروڑ رہے تھے مگر ان سب میں ایک غلامانہ عاجزی اور درخواست صاف نمایاں تھی۔

یا تو یہ سپاہی پروا نہ کرنے والا کوئی ظالم آدمی تھا اور یا بہت زیادہ جلدی میں تھا اور وہ کوئیں کے دامن میں کھڑے ہوئے ان لوگوں کی التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر گیا۔

اِن لوگوں کی قسمت اچھی تھی کیونکہ ذرا پیچھے ایک اور آدمی آ رہا تھا۔ یہ پنڈت کالی ناتھ تھا جو شہر میں ایک مندر کا بڑا پجاری تھا۔ بھیڑ نے اپنی التجائیں پہلے سے بھی زیادہ زور سے دہرائیں۔

پنڈت ہچکچایا، اس نے اپنی بھویں سکیڑیں اور ان لوگوں پر نظر ڈالی۔ اس کے جھریوں والے، پچکی ہوئی ہڈیوں کے مریل چہرے پر تردّد کے آثار تھے۔ مگر اس جیسے خشک آدمی کے لیے بھی اتنی پُرزور اِلتجا کو ٹھکرانا مشکل تھا مگر وہ ایک بدمزاج بوڑھا شیطان تھا اور اگر اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ کوئیں پر پانی کھینچنے کی ورزش سے شاید اس کی

پرانی قبض کو کچھ فائدہ ہو جائے تو وہ اِن ذات سے خارج لوگوں کی مدد کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا۔

وہ کوئیں کے اینٹوں کے چبوترے پر آہستہ سے چڑھ گیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اور اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے خدوخال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اپنے اندر پیدا ہوتے ہوئے ایک حریصانہ خیال کا شکار تھا۔ اس نے اس کام کی تیاری کے لیے جس کے لیے وہ رضامند ہو گیا تھا کافی دیر لگا دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا لیکن دراصل اس کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی۔ "وہ چاول" اس نے سوچا "جو میں نے کل کھائے تھے، اُن ہی کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے۔ میرا پیٹ جکڑا ہوا ہے۔ یا حلوائی کی دکان پر میں نے جو جلیبیاں دودھ میں ڈلوا کر کھائی تھیں شاید ان کی ہی وجہ سے ایسا ہو رہا ہو۔ اور لالہ بنارسی داس کے گھر پر جو کھانا کھایا تھا اس سے بھی یہ گڑبڑ ہو سکتی ہے۔" اس نے یاد کر کے سوچا۔ ساتھ ہی اسے ان لذیذ کھانوں کا بھی خیال آیا جو اسے اُس کے ججمانوں کے گھروں میں اکثر ملتے تھے۔ "کھیر بھی کتنی عمدہ اور لذیذ ہوتی ہے جو سفید دانتوں میں چپک جاتی ہے اور جس کا ذائقہ دیر تک منہ میں رہتا ہے اور کڑھا پرشاد یعنی وہ سوجی کا حلوہ، گھی میں تر، جس کے گرم گرم نوالے منہ میں ذرا سا ڈالتے ہی کیسے گھل جاتے ہیں۔ لیکن حقہ پی کر تو عام طور پر میرا پیٹ صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن آج صبح کا حقہ تو بے کار رہا جو میں نے ایک گھنٹے تک پیا لیکن بے سود۔ بڑی عجیب بات ہے۔" اس سوچ بچار میں اُسی نے جو وقت لیا اس میں اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے پیتل کے لوٹے کو کوئیں پر لکڑی کے چوکھٹے میں پیدا ہوئے نشیب میں دھنسا دیا تھا۔ انتظار کرتی ہوئی بھیڑ نے سوچا کہ شاید برہمن نچلی ذاتوں کے شودروں کی مدد کرنے پر ناخوش تھا اور اسی لیے اس کے چہرے کی جھریاں زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور چہرے سے ناراضگی اور چڑچڑاپن جھلک رہا تھا۔ انھیں یہ محسوس بھی نہیں ہوا کہ ایسا تو اس کی قبض کی وجہ سے تھا اور کسی حد تک اس کے ٹیڑھے میڑھے پتلے دُبلے اعضا میں طاقت کی کمی کی وجہ سے۔ انھیں جلد ہی اس کا پتہ لگ گیا جب پنڈت نے بہت ہی پس و پیش کرتے ہوئے قدموں کے ساتھ کوئیں پر رکھے ہوئے لوہے کے ڈول کو چوکھٹ میں بڑی چرخی سے لٹکی ہوئی رسی میں باندھا

اور آہستہ آہستہ اسے کوئیں میں اتار دیا۔ لیکن ڈول کے وزن کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے دستہ چھوٹ گیا اور تیزی سے چرخی واپس گھومی اور رسیوں کے سارے بل کھل گئے! وہ چرخی کی اس اچانک حرکت پر ڈر سا گیا۔ پھر اس نے ایک سنبھالا لیا اور نئی طاقت سے پھر کوشش کرنے لگا لیکن پھر ناکام رہا۔ پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو اوپر کھینچنے کے لیے اُن بازوؤں کی ضرورت تھی جو پنڈت کی کی ہوئی ورزش سے زیادہ سخت ورزش کے عادی تھے۔ اُس کی عمر تو کبھی نا ختم ہونے والے اشلوک پڑھتے پڑھتے گزری تھی یا کبھی وہ اپنے نیزے کے قلم سے کسی کو کوئی منتر لکھ کر دے دیتا تھا اور یا کسی کی جنم پتری تیار کر دیتا تھا۔ اس نے اپنی پوری طاقت لگائی اور چرخی پر سے رسی کو کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ بری طرح تن گیا اور اس کے خدوخال بگڑ گئے مگر خوشی بھی چہرے پر چمکی کیونکہ اپنے اعضا کی اِس ورزش سے اس نے اپنے پیٹ کو اور دلوں کے مقابلے میں اچانک کافی اچھا محسوس کیا۔ نچلی ذاتوں کے لوگ بھی پُر امید ہو کر اپنے اپنے گھڑوں کو تیار کر رہے تھے۔ لیکن زیادہ ضروری تو یہ تھا کہ اِس سب سے زیادہ رحم دل اور فیاض آدمی کے پاس سب سے پہلے کون پہنچتا ہے اور اب سب کی توجہ اِسی طرف مرکوز تھی۔ اور اس سے اُن پر یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ اُن کا 'پہلوان' کتنی کوشش کر رہا تھا اُنھوں نے بھی اپنی تمام طاقت اور قوتِ ارادی پاس آ کر اُس کے کام میں مدد کرنے میں لگا دی۔

آخر کار ڈول اینٹوں کے چبوترے پر رکھا گیا۔ لیکن برہمن کے پیٹ میں جو گڑبڑ ہو رہی تھی اور اس میں جو تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اس کا دھیان اُن کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک منٹ کے لیے وہ پھر کھویا کھویا سا لگنے لگا۔ ایک نامحسوس سی گرمی کی لہر اس کے پیٹ کی گہرائی تک اتر رہی تھی اور اس نے اپنے پیٹ کے عین وسط میں ایک ایسی حرکت سی محسوس کی جو اس نے مہینوں تک محسوس نہیں کی تھی اور وہ اس احساس سے بڑا خوش ہوا کہ اب اسے آرام مل جائے گا۔ مگر بدقسمتی سے اچانک اس کے دائیں طرف بغل میں ایسا زور کا درد اٹھا جیسے کسی نے اچانک نشتر چبھو دیا ہوا اور اس کے چہرے پر وہ تردد، بے چینی اور غصہ ابھر آیا جس کا وہ عادی تھا۔

"میں پہلے نمبر پر ہوں پنڈت جی۔" گلابو دھوبن اٹھلاتی ہوئی بولی اور برہمن

اچانک اپنے خیالات سے جاگ پڑا۔

پنڈت نے اس کی طرف غصّے بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے چہرے پر فاتحانہ اثرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُسے اُس التفات سے محروم کردیا جو شاید اس کا حق تھا اگر پنڈت ذرا سا بھی اُس کی طرف راغب ہوتا۔

"نہیں میں پہلے آیا تھا" ایک چھوٹا سا لڑکا چلّایا۔

"لیکن تجھے پتہ ہے کہ میں یہاں تیرے سے بھی پہلے بیٹھا تھا؟" ایک دوسرا آدمی چلّایا۔

اور کوئیں کی طرف بھیڑ نے دھاوا سا بول دیا جو عام حالات میں پجاری کو مجبور کردیتا کہ سب پر پانی پھینک دے۔ لیکن خوبصورت چہرے کو پہچاننے کے لیے وہ اچھی نگاہ رکھتا تھا، اسی طرح جیسے کسی درخواست کو سننے کے لیے اُس کے کان تیز تھے۔ سوہنی اس آگے بڑھتی ہوئی بھیڑ سے ہٹ کر پرے صبر سے بیٹھی تھی۔ پنڈت نے پہچان لیا کہ وہ تو جمعدار کی بیٹی ہے۔ اُس نے اسے پہلے دیکھ رکھا تھا اور اس وقت سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا جب سے وہ شہر میں گلیوں میں ٹٹیاں صاف کرنے آتی تھی ــــ ایک نوجوان دلکش بدن جس کی بھری بھری چھاتیاں اُس کے ململ کے مہین کرتے سے صاف جھلکتی تھیں اور جس کی معصوم، حیران سی شکل اُس کے اندر ایک عجیب نرم سا جذبہ جگا دیتی تھی مگر اس کے جسم کے اعضا کی کمزوری اس جذبے کو سخت بنا دیتی تھی۔ مگر احساس کی کمزوری اسے گمراہ کردیتی تھی اور اس میں ایک غرور ابھر آتا تھا کہ پجاری ہونے کی وجہ سے اس کا اپنے بھگتوں اور پیروکاروں پر پورا اختیار تھا۔ وہ سوہنی پر مہربانی کرنے کے لیے آمادہ تھا۔

"او لاکھا کی لڑکی، اِدھر آ" وہ بولا "تو نے بڑا صبر دکھایا ہے اور صبر کا انعام شاستروں کے مطابق سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اور تم سب شور مچانے والے پلّو، ہٹو میرا راستہ چھوڑو"

"لیکن پنڈت جی" سوہنی اس مہربانی کو قبول کرنے میں ہچکچاتے ہوئے بولی، اس لیے نہیں کہ پنڈت کی تعریف کو وہ کوئی دیوی دیوتا کی تعریف سمجھ رہی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اُن لوگوں سے ڈرتی تھی جو اُس سے پہلے کے آئے ہوئے تھے۔

"چل چل آگے آ" پنڈت نے زور دیا، رفع حاجت کے لیے اپنے پیٹ میں بڑھتے ہوئے دباؤ سے جھنجلاتے ہوئے اور ساتھ ہی اس بات پر خوش ہوتے ہوئے کہ وہ اس خوبصورت لڑکی کے لیے کچھ کر رہا ہے۔

لڑکی بھیگی بلی کی طرح آگے بڑھی اور اُس نے چبوترے کے نیچے اپنا گھڑا رکھ دیا۔ پجاری نے بڑی کوشش سے ڈول اٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس نے بڑی کامیابی سے پانی ڈالا کیونکہ اُس میں سوہنی کی قربت سے ایک گرمی پیدا ہوئی اور اُس سے اس میں جوش بھر گیا تھا بلکہ ایک نشہ سا ہو گیا تھا۔ پھر اُس کی روزمرہ کی کمزوری لوٹ آئی۔ چنانچہ اُس نے پانی اِدھر اُدھر گرا دیا اور سب نچلی ذات کے لوگ آدھے سوکھے اور آدھے گیلے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔

"بھاگو یہاں سے" وہ سوہنی کے گھڑے میں پانی ڈالتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی کمزوری کو اس ڈرانے والی حرکت سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار گھڑا تین چوتھائی بھر گیا۔

"مل گیا تجھے کافی پانی؟" پنڈت نے ڈول واپس لاتے ہوئے فتح کے احساس میں پوچھا۔

"ہاں پنڈت جی" سوہنی دھیمے سے بولی۔ حیا سے اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس نے باہر سے گھڑے کو صاف کیا اور اسے سر پر رکھ لیا۔

"دیکھ تو آکر مندر میں ہمارے گھر کے آنگن کو صاف کیوں نہیں کرتی؟" برہمن سوہنی کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر بولا "اپنے باپ سے کہیو کہ تجھے آج سے ہی بھیج دے" اور پنڈت اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ کچھ پریشان سا بھی ہوا کیونکہ وہ ایک بہت قابلِ عزت آدمی تھا اور وہ عزت اِس وقت ہوس کی اُن لہروں میں سے گزر رہی تھی جو اِس وقت اس کے خون میں موجزن تھیں۔

"دیکھ ضرور آئیو۔" پنڈت نے تحکمانہ لہجے میں کہا تاکہ سوہنی کے دل میں اِس بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔

سوہنی پنڈت کی آخری مہربانی کے لیے اس کی شکرگزار تھی۔ اُس نے شرم کے مارے بال میں سر ہلا دیا اور اپنے راستے پر چل دی۔ اُس کا بایاں ہاتھ اُس کی کمر پر تھا اور دایاں گھڑے پر

اور اس کے قدموں میں کسی گیت کے ترنم کا توازن تھا۔ دھوبن نے اسے کڑی نگاہوں سے دیکھا اور اور خود بڑے غصے سے دوسروں لوگوں کے ساتھ پھر کوئیں کے پاس آگئی اور سب کے سب ایک نئے آنے والے سے مدد کے لیے التجا کہنے لگے۔

یہ لچھمن تھا، ایک ہندو کہار۔ وہ ذات کا برہمن تھا اور اُس کو اپنے نیچے پیشے کے باوجود یہ اجازت تھی کہ وہ جاکر اونچی ذات کے ہندوؤں کے برتن صاف کرے، اُن کا کھانا بنائے، اُن کا پانی بھرے اور ان کے گھروں کا چھوٹا موٹا متفرق کام کردے۔ وہ چھبیس سال کا ایک نوجوان آدمی تھا۔ اس کے خدوخال سے ذہانت عیاں تھی مگر اُن میں ایک کھردراپن تھا جو مرتبے سے گرے ہوئے برہمن میں ہوتا ہے۔ اِس وقت اُس کے کندھوں پر اس کی بہنگی تھی۔ اُس نے اِسے آہستہ سے زمین پر رکھا اور چبوترے پر چڑھ کر ہاتھ جوڑ کے "جے دیو" کہہ کر پنڈت جی کو پرنام کیا اور بڑے ادب سے اُن کے ہاتھ سے ڈول لے کر کوئیں میں سے پانی کھینچنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ جونہی اس نے بڑی آسانی سے ڈول کوئیں میں اتارا، اُس نے ایک طرف کو مڑ کر گھر جاتی ہوئی سوہنی کو دیکھ لیا۔ اُس نے بھی سوہنی کو پہلے دیکھ رکھا تھا اور اس نے بھی اپنے خون میں چاہت کے ایک گرم جذبے اور خوشی کا احساس کیا تھا۔ بعد میں اُس نے بڑی شدت سے چاہا تھا، پہلے ڈر سے اور پھر امید سے، کہ وہ آگے لپک کر کسی دُور سے آواز دیتی ہوئی اجنبی سی شے تک پہنچ جائے۔ کچھ اور دیر کے بعد تو یہ خواہش اس کے ذہن اور اس کے جسم میں ایک شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھی۔ بعض دفعہ جب وہ کوئیں پر آئی تھی اور وہ بھی وہاں تھا تو اُس نے خوش دلی سے اس کے ساتھ چھوٹا چھوٹا مذاق کر کے اسے ناراض کر دیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی سوہنی نے اپنا ردِعمل ایک دبی دبی مسکراہٹ اور اپنی اُجلی چمکدار آنکھوں سے دیکھ کر بھی دیا تھا۔ اور وہ بھی، جیسا کہ وہ خود بھی کہتا تھا، اُس پر مرتا تھا۔ پنڈت نے اسے سوہنی کی طرف دیکھتے ہوئے پکڑ لیا۔ لچھمن نے جھینپ کر نظر لوٹائی اور اُسی خدمت گزاری کے جذبے میں، جو اس کے اندر دوسرے کمین لوگوں کی مانند تھا، چپکے سے اس کام پر لگ گیا جسے اُس نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھوں سے جلد ہی بھرا ہوا ڈول کوئیں کے اوپر لے آیا۔ پہلے اس نے پنڈت کا لوٹا اور پھر گلابو کا گھڑا بھر دیا۔ اِس کے بعد وہ دوسروں کی مدد کرنے

میں لگ گیا۔ سوہنی کی تصویر اس کے ذہن سے غائب ہو گئی۔

سوہنی اپنے کچے مکان کے کونے میں جو اُس کی رسوئی بھی تھی، پہنچ گئی۔ اس کا باپ جاگ چکا تھا مگر ابھی تک لحاف میں لپٹا ہوا چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے حقے کی بانس کی نے پر کش، پہ کش لگا رہا تھا۔ اس نے سوہنی کو دیکھتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں۔

"سور کی بچی میں نے سوچ لیا تھا کہ تو کہیں مر کھپ گئی ہوگی" لاکھا چلّایا "نہ چائے نہ روٹی کا ٹکڑا۔ بھوک کے مارے میرا دم نکل رہا ہے۔ چائے رکھ دے اور اُن سُور کے بچوں راکھا اور باکھا کو میرے پاس بلا کر لا" پھر وہ اِسی طرح نخشے میں چپ چاپ ہو گیا جیسے کوئی واقعی نیک اور اچھا آدمی ہو۔ اسے پتہ تھا کہ وہ ایک کمزور آدمی تھا مگر اپنے اختیار کو قائم کرنے کے لیے وہ بچوں کو یوں ڈراتا اور دھمکاتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی حکم عدولی کریں اور اسے بوڑھا اور ناکارہ آدمی سمجھ کر اس کی پرواتک نہ کریں۔

سوہنی نے ایک دم اس کا کہنا مان کر مٹی کی ہنڈیا آگ پر رکھ دی اور باہر جا کر اپنے دونوں بھائیوں کو زور زور سے آوازیں دیں۔

"او باکھیا، او راکھیا تمہیں باپو بلا رہا ہے"

اپنی بہن کی آواز سن کر صرف باکھا کمرے میں آیا۔ راکھا تو صبح ہی کھیلنے کے لیے کھسک گیا تھا۔

باکھا اپنے چہرے اور گردن پر سے پسینہ پونچھ رہا تھا اور اُس کا سانس چڑھا ہوا تھا کیونکہ وہ ٹٹیوں کی طرف دوسرا پھیرا لگا کر آیا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں سے آگ سی نکل رہی تھی اور اس کا بڑا چوڑا چہرہ تھکاوٹ کے مارے سکڑا ہوا سا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔

"میری کمر میں درد ہو رہا ہے" بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا جونہی وہ اپنے پورے قد کے ساتھ دروازے میں نظر آیا۔ اس کی آنکھوں کے سفید حصے چمک رہے تھے، "تو میری جگہ چلا جا اور مندر کے صحن میں جھاڑو دے آ اور سڑکیں صاف کر آ۔ اور جہاں بھی وہ سوّر راکھا کو بھیج دیو تاکہ وہ ٹٹیاں صاف کر آئے"

"باپو مندر کا پجاری تو کہہ رہا تھا کہ مندر میں اس کے گھر کی صفائی میں کیا کروں"۔
سوہنی بول اٹھی
"تو جا تو کر آ، میرا دماغ کیوں کھا رہی ہے!" لاکھا جھنجلا کر بولا
"باپو تیرے کیا بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟" باکھا نے طنز سے پوچھا تاکہ اس کے باپ کو اس کی بد دماغی کا احساس ہو" اگر تو چاہے تو میں وہاں تیل مل دوں"۔
"نہیں نہیں" بوڑھا تنگ کر بولا اور اس نے شرم سے اپنا چہرہ چھپالیا جو اسے اپنے بیٹے کے چھپے ہوئے احتجاج پر آ رہی تھی۔ اُس کی کمر میں یا کہیں اور کوئی درد نہیں نہیں تھا اور وہ مکاری کر رہا تھا کیونکہ بڑھاپے میں وہ کام سے کتراتا تھا اور بچے کی طرح کام سے بچنے کے بہانے بناتا رہتا تھا۔ "نہیں نہیں تو جا اور کام کر۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا" اور وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ اِس اثنا میں چائے تیار ہو گئی تھی۔ سوہنی نے دو مٹی کے گلاسوں میں جو اندر سے چینی کی طرح چکنے تھے چائے ڈالی۔ باکھا آیا اور اس نے ایک اٹھا کر باپ کو دیدیا۔ پھر اس نے دوسرا اٹھایا اور بڑی بے تابی سے اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ چائے کے تیز گرم ذائقے سے اس کے سارے جسم میں ایک عجیب مسرت بھر گئی۔ ہاں اِس گھونٹ سے اس کی زبان تھوڑی سی جل گئی کیونکہ اپنے باپ کی طرح اُس نے پینے سے پہلے اسے ٹھنڈی کرنے کے لیے اس میں پھونکیں نہیں ماری تھیں۔ یہ ایک اور بات تھی جو اس نے انگریزوں کی بارکوں میں ٹامیوں سے سیکھی تھی۔ اس کے چچا نے کہا تھا کہ انگریز چائے کی مہک اور ذائقے کا پورا لطف نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ اس میں پھونکیں نہیں مارتے۔ لیکن باکھا کا خیال تھا کہ اس کے چچا اور اس کے باپ کی سڑپ سڑپ کر کے چائے پینے کی عادت خالص "کالے آدمی" کی تھی۔ وہ اپنے باپ کو بتا دیتا کہ صاحب لوگ ایسا نہیں کرتے لیکن عادتاً وہ اتنی عزت کرنے والا لڑکا تھا کہ وہ ایسا کبھی نہ کرتا اگرچہ وہ خود انگریزوں کے طریقے کو مانتا تھا اور سختی سے اُس پر عمل کرتا تھا۔ چائے پینے اور ٹوکری میں سے ایک روٹی کھا کر جو سوہنی نے باپ کے سامنے رکھ دی تھی، باکھا چلا گیا۔ اس نے پتلی پتلی سینکھوں والی جس پر لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا ایک موٹی سی جھاڑو اور ٹوکری اٹھائی جو اس کا باپ سڑکیں صاف کرنے کے لیے لے جاتا تھا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ آج پہلی دفعہ اس کے باپ کی اچانک

بیماری کی وجہ سے اس کی صبح کی ہوئی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

وہ گلی جو نچلی ذات کے لوگوں کی سڑک کی طرف جاتی تھی جلد ہی پیچھے رہ گئی۔ آج یہ گلی اسے بہت ہی چھوٹی لگی تھی۔ اس گلی کے ختم ہوتے ہی سورج کی روشنی کسی بھٹی کی آگ کی طرح، نچلی ذات کے لوگوں کی بستی سے پرے، زمین پر کھلی جگہ پر پھیل گئی۔ باکھا اپنے سامنے پھیلی ہوئی چپٹی زمین کی صاف تازہ ہوا کو سونگھا اور بڑے مہمل انداز میں میلے کی دنیا کی دھواں آلود، متعفن فضا اور سورج کی چمکدار اور صاف دنیا میں فرق محسوس کیا۔ وہ اپنے جسم کو گرمی پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ گرمی اس کی انگلیوں کے پوروں میں گھس جائے جہاں کی کھال سخت، کھردری اور بھربھری سی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دھوپ اس کے ہاتھوں کی ابھری ہوئی نیلی رگوں کے خون کو پگھلا دے۔ اس نے اپنے ہاتھ الٹے کیے تاکہ اُن پر سورج کی دھوپ پڑ جائے۔ ایک لمحے کے لیے تو اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ سورج کی طرف کر لیا اور ٹھوڑی کو بالکل اٹھا لیا۔ اسے بہت ہی اچھا لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں ایک جوش بھر رہا ہے، ایک عجیب احساس جو اُس کے جسم کی تمام سطح پر پھیل گیا اور ایک حرارت اس کی بے حس کھال میں اندر تک گھس گئی۔ اس خوشگوار ماحول میں اس نے اپنے اندر ایک طاقت محسوس کی۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے چہرے کو ملا تاکہ اس کے مسام کھل جائیں اور یہ گرم ہو کر سورج کی کرنیں اپنے اندر جذب کر لیں۔ اس نے اپنی جھاڑو اور ٹوکری کو بغل میں تھام لیا اور اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے چہرے کو خوب رگڑا۔ اس نے ایک دو زور کے ہاتھ مارے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے سایے تلے خون اس کے گالوں سے اوپر اس کی ابھری ہوئی گالوں کی ہڈیوں تک پہنچ گیا تھا اور پھر سر کے دونوں طرف کانوں تک اور کانوں کی لویں بھی سرخ اور شفاف ہو کر چمکنے لگی تھیں۔ اسے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بچپن میں جاڑوں کے دنوں میں اتوار کو دھوپ میں صرف ایک لنگوٹی پہن کر ننگے بدن کھڑا ہو جاتا تھا اور اپنے بدن پر سرسوں کے تیل کی مالش کرتا تھا۔ اس بات کو یاد کر کے اس نے پھر سورج کی طرف دیکھا۔ سورج کی کرنوں کی بھرپور چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔ سورج کی چمکیلی کرنوں سے وہ کچھ بوکھلا سا گیا اور اسے

ایسا لگا کہ سورج کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہر طرف، اس کے اندر، اس کے اوپر اس کے آگے، اس کے پیچھے، ہر جگہ سورج ہی سورج ہے۔ یہ ایک خوشگوار جذبہ تھا باوجود اس بات کے کہ چشم زدن میں ہی اس نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ذہنی دباؤ کے ایک ارفع خطّے میں معلق تھا۔

جب وہ اس چمکیلی، شفاف اور نایاب دنیا سے، جس میں وہ پہنچ گیا تھا، باہر آیا تو وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور اس نے ایک گالی دی۔ سامنے جھانکتے ہوئے اس نے دیکھا کہ دھوبی کا لڑکا رام چرن، چمار کا لڑکا چھوٹا اور اس کا اپنا بھائی راکھا اس کی حرکتوں کو دیکھتے رہے تھے۔ اسے بڑی شرم محسوس ہوئی کہ انھوں نے اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ویسے بھی اسے چھیڑتے رہتے تھے۔ کبھی اس کے بھاری بدن کا مذاق اڑاتے، کبھی اس کے کپڑوں کی ہنسی اڑاتے، کبھی اس کی چال کی جو کچھ تو اس کے موٹے ہلنے والے کولہوں کی وجہ سے ہاتھی کی طرح اور کچھ چستی اور تیز رفتاری کی وجہ سے شیر کی طرح تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ سب اس کا مذاق اڑائیں گے، اگر انھوں نے اسے اپنے چہرے کی مالش کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا یا اپنے آپ سے بولتے ہوئے خاص طور جب کہ انھیں پتہ تھا کہ وہ "فیشن" کا دلدادہ تھا۔ اگرچہ یہ کمزوری ان میں بھی تھی مگر پھر بھی اس کے لیے وہ اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔ باکھا ہمیشہ دھوبی کے لڑکے کی بے پلکوں اور بھنووں والی آنکھوں کا ذکر کر کے جوابی حملہ کرتا اور کہتا "یہ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ تو اپنی چمڑی کو گورا بنانے کے لیے دنیا بھر کا صابن استعمال کرتا ہے۔" اور رام چرن کے بارے میں کئی دوسری باتیں بھی کہنے والی تھیں: ایک تو یہی کہ گلابو جیسی عورت اس کی ماں تھی؛ دوسرے اس کی خوبصورت بہن بھی عشق لڑانے والی تھی اور وہ خود مریل تھا اور اس کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور وہ ایک کانے گدھے پر سوار ہو کر گھاٹ جاتا تھا جس کا خوب مذاق بن سکتا تھا۔ ہاں چھوٹا پر چھینٹا اڑانا مشکل تھا کیونکہ وہ عمدہ خد و خال کا گلی کا سب سے حسین لڑکا تھا جو ہر وقت اپنے بالوں کو خوب تیل لگا کر سنوارے رکھتا تھا، خاکی نیکر اور ٹینس والے سفید جوتے پہنتا۔ باکھا تو اسے ایک مثالی 'جنٹل مین' سمجھتا تھا۔ باکھا کی نظر میں تو وہ اس قسم کا لڑکا تھا جس کی وہ تعریف

کرے اور اُس کے پیچھے چلے۔ اِس لیے اس کے ساتھ اس کا اتنا گہرا یارانہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ جو بھی مذاق کرتے اس کا زیادہ برا نہ منایا جاتا۔

"ابے سالے اِدھر آ" رام چرن اپنی بنا بھوؤں کی آنکھوں کو جھپکاتا اور اوپر دیکھتا ہوا بولا۔

"میں تو تیرا بہنوئی بننے کو تیار ہوں، اگر تو بنائے"۔ باکھا نے رام چرن کی چھوٹی سی گالی کو مذاق میں بدلتے ہوئے کہا۔ یہ بات ہر ایک کو پتہ تھی کہ وہ رام چرن کی بہن کی بڑی تعریف کرتا تھا۔

"ابے اس کی تو شادی آج ہو رہی ہے۔ تو نے دیر کر دی" رام چرن نے جواب دیا۔ وہ یہ سوچ کر بڑا خوش ہوا کہ اب آئندہ باکھا اس کے ساتھ یہ مذاق نہیں کر سکے گا۔

"اچھا تو اسی لیے تو آج یہ بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے ہے" باکھا بولا "اب پتہ لگا۔ بڑی عمدہ واسکٹ ہے، صرف ذرا سی گھسی ہوئی ہے، وہ مخمل پر سنہری دھاگا۔ تو اِس پر استری کیوں نہیں کر لیتا؟ اور ہاں یار یہ زنجیر تو بڑی اچھی لگی۔ یہ تو بتا کیا اِس کے ساتھ گھڑی بندھی ہوئی ہے یا یہ صرف فیشن کے لیے پہنی ہوئی ہے؟"

رام چرن کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا اور وہ چپ ہو گیا۔ چھوٹا چپ چاپ اِن کی باتیں سن کر بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ راکھا کو شاید ٹھنڈ لگ رہی تھی کیونکہ اُس نے باکھا کے رد کیے ہوئے اپنے پھٹے پرانے اوورکوٹ کی آستینوں کو کھینچ کر انھیں اپنے ہاتھوں کے دستانے بنا لیا تھا اور اس نے اپنے بازو سختی سے اپنی چھاتی پر رکھ کر بغلوں میں گھسیڑے ہوئے تھے۔ نچلی ذات کے کچھ اور لوگ بھی یہاں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے اپنی قمیضوں اور پاجاموں کی تہوں میں جوئیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مار رہے تھے اور وہ دھوپ میں اتنے مزے سے بیٹھے ہوئے تھے کہ سر اٹھا کر دیکھنے کا بھی خیال انھیں نہیں آیا۔ دھوپ میں کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے اُن کے کالے ہاتھ اور پاؤں دکھائی دے رہے تھے اور وہ سب کے سب بھدّے، گندے اور کاہل نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن سب کی توجہ اِس وقت اپنی روحوں میں گھسے ایک ٹھنڈے جذبے سے ایک گرم دنیا میں منتقل ہونے کے عمل کی طرف تھی اور اسے ایک نئے جنم سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ اُن کے ایک کمرے کے تنگ و تاریک اور متعفن جیل خانوں کے داغ

ان میں اِس باہر کی کھلی فضا میں بھی نمایاں تھے۔ وہ خاموش تھے جیسے کہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کا عمل اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ حیات بخش آفتاب نے اُن کی پوشیدہ گرہوں کو کاٹ دیا تھا جن سے انھوں نے خود اپنے آپ کو باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ اِسی نے اُن کے جسموں کے نہاں خانوں کی سب تہوں کو پگھلا سا دیا تھا اور اُن کی روحیں اِس تمام معجزے کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں، اس کے راز اور جادو کو سمجھ رہی تھیں۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے باکھا سے اس کا حال چال پوچھا۔ لیکن باکھا تو انھیں خوب سمجھتا تھا کیونکہ اگرچہ وہ انھیں اپنے سے کمتر سمجھتا تھا، اِس وجہ سے کہ اس کی عقل اور ذہانت تو انگریزوں کی بارکوں میں تیز ہوئی تھی، لیکن وہ سب اس کے پڑوسی تھے، اس کے دوست جن کی زندگیوں، خیالات اور احساسات کے ساتھ اُسے سمجھوتہ کرنا لازمی تھا۔ وہ اُن سے کسی تکلف کی امید نہیں کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر ان کے ساتھ ٹھہرا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سوچ میں ڈوبی ہوئی، عجیب اور اچنبھے والی بھیڑ کا حصّہ بن گیا تھا جو اِس وقت بیٹھی ہوئی دھوپ سینک رہی تھی۔ اس بھیڑ کا حصہ بننے کے لیے کسی کو کوئی شائستگی برتنے یا سلام و دعا کرنے کی ضرورت نہیں تھی جیسا کہ آدمی اس دنیا میں کرتا ہے جہاں بہت سی روشنی اور مسرت ہے۔ کیونکہ اِن پچھڑے ہوئے آدمیوں کی زندگیوں میں، جو زمین کے کیڑے اور ننگِ انسانیت تھے، صرف خاموشی، گہرا سکوت اور زندگی کے لیے لڑتی ہوئی موت کی خاموشی ہی تھی۔

چونکہ باکھا ان کے ساتھ تھا، اس لیے صبح کی خوبصورتی کے بارے میں اس کا اور دوسروں کا ردعمل ظاہر ہوا۔

"او باکھے،" چھوٹا دھوپ میں خوش ہو کر بولا اور وہ دھوپ میں کھیلنے والا ایک بچّہ لگ رہا تھا اور روشنی اس کے کالے چکنے چہرے پر کھیل رہی تھی "آج تو ادھر کہاں جا رہا ہے؟" "میرا باپ بیمار ہے" باکھا نے جواب دیا "اس لیے میں شہر کی سڑکیں اور مندر کے صحن کو صاف کروں گا۔" پھر وہ اپنے بھائی کی طرف مڑا اور بولا۔ "راکھیا تو صبح صبح ہی دوڑ کر آ گیا۔ باپو بیمار ہے اور میرے اِدھر آنے پر ٹٹیوں کی صفائی کا کام بھی کسی کو کرنا ہے۔ تو دوڑ کر گھر جا۔ سوہنی نے تیرے لیے تھوڑی سی گرم چائے بھی رکھی ہوئی ہے۔"

پست قد، لمبوترے چہرے اور گٹھیلے جسم کے راکھا کو اپنے بھائی کا اسے اس طرح کہنا برا لگا لیکن وہ جلدی سے اٹھا اور غصّے سے گھر کے راستے پر ہولیا۔

"ابے مت جا" رام چرن نے شرارتاً پیچھے سے پکارا" یہ تیرا بھائی تو جنٹر مین بننا چاہتا ہے اور سڑکوں پر کام کرنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تو ٹٹیوں کا گندا کام کرے۔"

"ابے سالے بک بک مت کر" باکھا نے مذاق میں کہا۔" اسے جانے دے تاکہ کچھ کام کرے۔"

"آ کشتی کھیلیں" چھوٹا لال لالٹین کی سگریٹ کے پیکٹ کی طرف دیکھتا ہوا بولا جو اس نے اپنی قمیض کی جیب میں سے یہ دیکھنے کے لیے نکالا تھا کہ اس میں کتنی باقی ہیں، اس سے پہلے کہ وہ ایک باکھا کو پیش کرے۔" آجا" وہ بولا "چل دونوں دوسروں کے ساتھ مل کر کھیلتے ہیں۔" اُس کا مطلب کالی چمڑی کے باجہ بجانے والے کلیٹن اور بڑھئی کے لڑکے گوڈو سے تھا جو زمین میں ایک چھوٹا سا گول گڑھا کھود کر گولی کھیل رہے تھے۔

"آجا"، چھوٹا زور دے کر بولا" کچھ پیسے جیت لیں گے۔"

"نہیں مجھے تو ہر حالت میں کام پر جانا ہے۔" باکھا نے اسے قطعی طور پر منع کرتے ہوئے کہا۔" میرے باپ نے دیکھ لیا تو ناراض ہوگا۔"

"ارے چھوڑ بڈھے کو، تھوڑی دیر کے لیے آجا۔" چھوٹا نے اسے مناتے ہوئے پھر زور دیا۔

"آجا یار آجا۔" رام چرن نے اکسایا۔

یہ سب بھگوڑے تھے اور انھیں ڈر تھا کہ کسی بھی وقت اُن کے والدین کی آواز آجائے گی۔ لیکن وہ خطرے والی زندگی میں اعتقاد رکھتے تھے اور انھوں نے صبح کی دھوپ میں کھیل کود کو کبھی نہیں چھوڑا چاہے انھیں گھر پر کتنی ہی گالیاں یا مار پڑی ہو۔ لیکن باکھا با اصول لڑکا تھا۔ اس کا فرض اس کے سامنے پہلے آتا تھا اگرچہ وہ تمام کھیلوں کا ماہر تھا اور کُشتی میں انھیں آسانی سے ہرا دیتا۔ لیکن وہ اپنے کام کا پکا تھا اور آگے بڑھنے لگا۔

"اچھا ٹھہر" چھوٹا بولا " دیکھ وہ بڑے بابو کا لڑکا آرہا ہے۔ آج کی ہاکی کا کیا سوچا؟ ۳۱ پنجابی پلٹن کے لڑکوں نے ہمارے ساتھ میچ کھیلنے کا چیلنج دیا ہے۔"

"اگر میرے باپ نے مجھے اجازت دیدی تو میں آ جاؤں گا" باکھا بولا۔ پھر اس نے ایک طرف دیکھا اور دو سفید کپڑے پہنے ہوئے نازک سے چھوٹے لڑکوں کو دیکھ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ ماتھے تک اٹھایا اور بڑے ادب سے بولا "سلام بابو جی"۔

ان دونوں میں جو بڑا لڑکا تھا، سادہ، معصوم، دس سال کا بھولا بھالا، نازک سا پتلا دبلا، چپٹی ناک اور ابھری ہوئی گالوں کی ہڈیوں والا، وہ جواب میں مسکرا دیا۔ چھوٹے لڑکے کا چہرہ جو تقریباً آٹھ سال کا ہوگا شرارتی سا مصنوعی تھا اور اس کی چوڑی پیشانی سے لے کر، باہر نکلتے ہوئے موٹے ہونٹ اور چھوٹی سی نمایاں ٹھوڑی تک، اس کے انگ انگ میں ایک پھڑک تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ بھی کوئی اہم لڑکا تھا۔

"آؤ چھوکرو" رام چرن اور چھوٹا نے ایک گستاخانہ شیخی کے ساتھ اپنے جسموں کو ہلا کر کہا " آج ہاکی کھیلو گے؟ ۳۱ پنجاب پلٹن کے لڑکوں کے ساتھ ہمارا میچ ہے"۔

"ہم دوپہر کے بعد کھیلیں گے"، چھوٹے لڑکے نے اپنے بھائی کی انگلی پکڑے ہوئے، وہیں زمین پر کودتے ہوئے جوش وخروش سے کہا۔ وہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ ہاکی بھی مشکل سے پکڑ سکتا تھا اور اس نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ اس سے تو پوچھا بھی نہیں گیا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ لڑکے اسے چھوٹا ہونے کی وجہ سے کبھی نہیں کھلاتے اور اس وجہ سے بھی نہیں کہ اگر کھیل میں اس کے چوٹ لگ گئی تو گھر جا کر ان کی شکایت کر دے گا۔

"اچھا تو کیا تو ہمیں ہاکیاں دے گا؟" رام چرن نے مکاری سے بچے کے جوش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ اُس کا ارادہ اُس سے وعدہ لینے کا تھا، اگرچہ اس وعدے کے پورا ہونے کے مقابلے میں ٹوٹنے کی زیادہ امید تھی۔ مگر اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر بچے نے عین کھیل کے وقت ضد کی جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتا تھا، جب اُسے کھلایا نہیں جاتا تھا تو وہ اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ تو نے ہاکیاں نہیں دیں۔

بابو کے بیٹوں کا، اُن کے باپ کے اونچے عہدے کی وجہ سے، رجمنٹ کی ہاکی

ٹیم کے کپتان کے ساتھ بڑا رسوخ تھا اور انھوں نے اُس سے ایک درجن کے قریب رُدی ہوئی پرانی ہاکیاں لے لی تھیں۔ بڑوس کی بستی کے لڑکے جو ۳۸ ویں ڈوگرا رجمنٹ کی ٹیم میں شامل زیادہ تر اچھوتوں کے غریب لڑکے تھے ہر سہ پہر کو مشق کے لیے کھیلنے کے لیے بابوؤں کے بیٹوں کی سخاوت پر انحصار کرتے تھے کہ وہ انھیں ہاکیاں کہیں سے لاکر دیدیں گے۔ بڑا لڑکا تو ہمیشہ ان کی بات مان لیتا تھا اور وہ اچھوتوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے اپنی ماں کی گالیاں بھی خوشی سے سہہ لیتا تھا لیکن چھوٹے لڑکے کو ماننے کے لیے اس کی کافی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔

" ہاں " وہ بولا " میں حوالدار چرت سنگھ سے ایک نئی بڑھیا ہاکی لایا ہوں۔ اور ایک نئی گیند بھی " پھر اس نے بڑی ناراضگی سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور اسے کہنی مار کر بولا۔ " چل، کیا آج اسکول نہیں جانا ہے ؟ ہمیں دیر ہو جائے گی "

باکھا نے وہ جوشیلی اور پُر اشتیاق نظر دیکھ لی تھی جس سے چھوٹے لڑکے کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اسکول جانے کا ذکر! کتنا اچھا لگتا تھا! پڑھنے لکھنے کے قابل ہونا کتنی عمدہ بات تھی۔ اسکول کی پڑھائی کے بعد آدمی اخبار تک پڑھ سکتا تھا، صاحب لوگوں سے بات کر سکتا تھا۔ اُس کے پاس جب کبھی کوئی چٹھی آتی تو اسے پڑھوانے کے لیے اسے منشی کے پاس دوڑنا نہیں پڑتا تھا اور نہ اپنی چٹھیاں لکھوانے کے لیے اسے پیسے دینے کی ضرورت تھی۔ اس نے اکثر چاہا تھا کہ وارث شاہ کی ہیر اور رانجھا پڑھ لے۔ اور جب وہ گوروں کی بارکوں میں ہوتا تو اس کے اندر ایک خواہش بھڑک اٹھتی کہ وہ بھی اُن کے ساتھ " ٹِش مِش، ٹِش مِش " بولے جو ٹامی بولتے تھے۔

جب اُس نے انگریزوں کی بارکوں میں اپنے چچا سے اپنی صاحب بننے کی خواہش کا ذکر کیا تھا تو اُس کے چچا نے اسے بتایا تھا کہ اسکول بابوؤں کے بچوں کے لیے بنے تھے نہ کہ نیچ ذات کے بھنگیوں کے لیے۔ اُس وقت وہ یہ وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ بعد میں انگریزوں کی بارکوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ کیوں اُس کے باپ نے اسے اسکول نہیں بھیجا تھا۔ وہ ایک بھنگی کا بچہ تھا اور کبھی بابو نہیں بن سکتا تھا اس کے اور بعد میں بھی اسے پتہ لگا تھا کہ ایسا کوئی اسکول نہیں تھا جو اس کو داخل

کرلیتا کیونکہ دوسرے بچوں کے والدین یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ نچلی ذات کے بچے انھیں چھوکر بھرشٹ کردیں۔ وہ کتنی بے وقوفی کی بات تھی، اس نے سوچا کیونکہ ہندوؤں کے بچے باکی کھیلتے ہوئے اسے خوشی سے چھوتے تھے اور انھیں اس کے ساتھ اسکول میں بیٹھنے پر کبھی کیا اعتراض ہوتا۔ لیکن اسکول کے ماسٹر نچلی ذات کے بچوں کو پڑھانے کے لیے تیار نہیں تھے، مبادا ان کی انگلیاں جو وہ بچوں کو کتاب پڑھاتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ رکھتے تھے ان کی کتاب کے اوراق سے چھوکر بھرشٹ ہو جائیں! یہ قدامت پسند ہندو بڑے ظالم تھے۔ وہ بھنگی تھا، یہ وہ جانتا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے چھ سال کی عمر سے ٹٹیاں صاف کرنے کا کام شروع کردیا تھا اور اس پیشے میں وراثت میں ملی ہوئی زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ لیکن وہ صاحب بننے کے خواب تو دیکھ رہا تھا۔ کئی دفعہ اس نے شدت سے احساس کیا کہ وہ خود ہی پڑھ لے۔ اس تخیّل کو انگریزوں کی بارک کی زندگی نے بھڑکایا تھا۔ وہ اکثر خاموشی سے اپنے فالتو وقت میں بیٹھ جاتا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ پڑھنا کیا ہوتا ہے۔ حال ہی میں وہ واقعی شہر جاکر انگریزی کا پہلا قاعدہ خرید لایا تھا۔ لیکن اس کا اپنا مطالعہ حروفِ ابجد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔
آج جب وہ کھڑا ہوا اس چھوٹے سے خواہشمند لڑکے کو اپنے بھائی کو اسکول جانے کے لیے کھینچتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اس کے اندر ایک شدید جذبہ ابھر آیا کہ وہ بابو کے لڑکے سے اسے پڑھانے کے لیے کہے۔

"بابوجی" وہ بڑے لڑکے سے بولا۔ "اب تم کون سی جماعت میں ہو؟"

"پانچویں جماعت میں" لڑکے نے جواب دیا۔

"تو اب تمھیں اتنی انگریزی آتی ہوگی کہ دوسرے کو بھی پڑھا دو۔"

"ہاں" لڑکا بولا

"تو کیا تم مجھے ہر روز ایک سبق دینے کی تکلیف کروگے؟" لڑکے کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے باکھا نے یہ بھی کہدیا "میں اس کے لیے تمھیں پیسے دونگا۔"

باکھا نے یہ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی سی آواز میں کہا اور ہر لفظ کے ساتھ اس کا انکسار اور اس کی صداقت گہری ہوتی گئی۔

بابو کے بیٹوں کو جیب خرچ کے لیے زیادہ پیسے نہیں ملتے تھے۔ اُن کے والدین کفایت شعار تھے اور سوچتے تھے اور شاید ٹھیک ہی کہ بچوں کو اِدھر اُدھر باہر کی چیزیں نہیں کھانی چاہئیں، جیسے کہ نچلی ذات کے بچے بازار میں چیزیں خرید کر کھاتے رہتے ہیں۔ بڑے لڑکے کے اندر تو پیسے کے لیے ایک مضبوط جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنے پیسے جس کسی سے بھی ملتے جوڑتا رہتا تھا۔

"بہت اچھا" وہ بولا "میں پڑھا دوں گا لیکن . . ." وہ موضوع کو بدلنا چاہتا تھا تاکہ پیسے کے لیے اس کی دبی ہوئی خواہش زیادہ نہ ظاہر ہو جائے۔ باکھا اس کے دیکھنے کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"میں ایک سبق کا تمہیں ایک آنہ دوں گا۔"

بابو کا بیٹا ایک بناوٹی ہنسی ہنسا جو اتنی کم عمر کے بچے میں بڑی عجیب لگی اور اس نے اپنی منظوری دے دی اور بعد میں سوچ کر پیسے پر مر مٹنے والے آدمی کے روایتی انداز میں اس نے کہا۔ "مجھے پیسوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔"

"تو ہم آج دوپہر کے بعد سے ہی کیوں نہ شروع کر دیں؟" باکھا نے التجا کی۔

"ہاں" لڑکا مان گیا اور وہ کھڑے رہنے، بات کرنے اور اس تعلق کو خوشگوار لفظوں سے مضبوط بنانے کے لیے تیار تھا لیکن اس کا چھوٹا بھائی اب تنگ آ چکا تھا اور اس کی آستینیں کھینچ رہا تھا نہ صرف اِس لیے کہ انھیں اسکول کے لیے دیر ہو رہی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اپنے بھائی کے زیادہ پیسے بنانے کے خیال سے خوش نہیں تھا۔ اسے جلن سی ہو رہی کہ اس کا بھائی پیسے کمائے گا۔

"چل" چھوٹا لڑکا چلّایا۔ "دھوپ تقریباً سر پر آگئی ہے۔ اسکول میں دیر سے آنے پر مار پڑے گی۔"

باکھا کو بچے کے غصّے کی نوعیت کا پتہ لگ گیا اور اس نے اسے رشوت دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔

"چھوٹے بھیّا تم بھی تو مجھے پڑھاؤ گے۔ بولو پڑھاؤ گے نا؟ میں تمہیں ایک پیسہ روز دوں گا۔"

باکھا جانتا تھا کہ اِس سے لڑکے کا حسد کم یا ختم ہو جائے گا اور اس سے وہ

غصے میں اپنے گھر میں بڑے بھائی کی شکایت کر دے۔ اُسے پتہ تھا کہ اگر اس نے ماں کو بتا دیا کہ گھر کے باہر اس کا بڑا بھائی ایک بھنگی کو پڑھنا لکھنا سکھا رہا تھا تو وہ شاید غصے میں آگ بگولہ ہو کر بے چارے کو گھر سے نکال دے۔ وہ ایک دھارمک خیالات کی ہندو عورت تھی۔

چھوٹا لڑکا اس وقت کافی پریشان تھا اور وہ اس رشوت کی قیمت کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اسکول کی طرف دیکھا اور دیر سے جانے کا خیال اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے کرتے کا نچلا حصہ پکڑا اور اسے کھینچ کر لے گیا۔

باکھا نے انھیں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس بات پر بڑا خوش تھا کہ وہ دوپہر کے بعد اپنا سبق پڑھے گا اور آگے چلنے لگا۔

"رُک جا او بابو۔ اب تُو تو بڑا آدمی بننے والا ہے" رام چرن نے طنزیہ لہجے میں پکارا "اب تو ہم سے کہاں بات کرے گا۔"

"تو تو پاگل ہے" باکھا مذاق سے بولا "مجھے ضروری جانا ہے۔ سورج سر پر چڑھ آیا ہے۔ مجھے مندر کا راستہ اور صحن صاف کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اپنا پاگل پن آج تجھے باکی میں دکھاؤں گا۔"

"بہت اچھا،" باکھا شہر کے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ایک بازو کے نیچے اس کی ٹوکری تھی اور دوسرے کے نیچے جھاڑو۔ اس کے دل میں کسی پرندے کی خوشی کا ترانہ تھا۔

"ٹن ٹن ٹن ٹن" اس کے پیچھے ایک تیز آتی ہوئی بیل گاڑی کی گھنٹیاں بجیں۔ وہ دوسرے پیدل چلنے والوں کی طرح سڑک کے بیچ میں چل رہا تھا۔ وہ اپنے بوٹ کو دُھر مٹی میں گھسیٹتا ہوا ایک طرف کو ہو گیا۔ میونسپل کمیٹی کی نالائقی کی وجہ سے جہاں پیدل چلنے والوں کی جگہ پکی ہونی چاہیے تھی، نہیں تھی۔ چلتے ہوئے مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرّے اڑ کر اس کے چہرے پر پڑ رہے تھے اور مٹی میں دھنسے ہوئے بیل گاڑی کے پہیوں کی چوں چوں کی آواز اسے بھلی لگ رہی تھی۔ شہر کے دروازوں کے پاس کئی دکانیں تھیں جن پر شمشان گھاٹ میں، جو پاس ہی تھا، مردوں کو جلانے کے لیے آنے والے لوگوں کو لکڑی بیچی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک دکان پر ماتم کرنے والے کچھ لوگ

کھڑے تھے۔ وہ ارتھی اٹھائے ہوئے تھے جس میں لال کفن میں لپٹی ہوئی جس پر چاند ستارے چھپے ہوئے تھے، لاش تھی۔ باکھا نے لاش کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اسے موت کے خوف نے جکڑ لیا۔ یہ خوف ایسا تھا جو کسی سانپ یا ڈاکو کے روبرو ہو کر ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی، "ماں نے کہا تھا کہ جب آدمی گھر سے باہر ہوتا ہے تو کسی مردے کو دیکھنا خوش قسمتی کی نشانی ہے" اور وہ چلتا رہا اور چھوٹی چھوٹی پھلوں کی دکانوں کو پار کر گیا جہاں میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے مسلمان اپنے سامنے رکھے ہوئے گنے کے ڈھیروں کو کاٹ کر ان کی گنڈیریاں بنا رہے تھے۔ اُن کے مُنڈے ہوئے تھے اور ان کی داڑھیاں سرخ رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ہندو حلوائیوں کی دکانوں کو بھی پار کر گیا جو چھوٹی چھوٹی بید کی تپائیوں پر رکھے ہوئے لوہے کے تھالوں میں سجی ہوئی مٹھائیاں بیچ رہے تھے۔ آخر میں وہ پان کی دکان پر پہنچ گیا جہاں تین بڑے آئینے، خوبصورت میموں کی تصویریں اور ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ یہاں پر ایک میلی کچیلی پگڑی پہنے ہوئے آدمی دل کی شکل کے پتوں کو کتھا اور چونا لگا رہا تھا۔ اس کے دائیں طرف بکسوں میں لال لالٹین اور قینچی کی سگرٹیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے بائیں طرف ملک میں بننے والی طرح طرح کی بیڑیوں کے بنڈل کئی لائنوں میں رکھے ہوئے تھے۔ باکھا نے چپکے سے ایک لٹکے ہوئے آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور اس کی نظریں سگرٹوں پر جا کر رک گئیں۔ باکھا اچانک رک گیا اور دکاندار کے سامنے کھڑے ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے پوچھنے لگا کہ "لال لالٹین" کا پیکٹ خریدنے کے لیے وہ پیسے کہاں رکھ دے۔ دکاندار نے اپنے پاس رکھے ہوئے تختے پر اس جگہ کا اشارہ کر دیا۔ باکھا نے وہاں اکنی رکھ دی۔ دکاندار نے اپنے اس گلاس سے جس میں سے وہ بار بار پان کے پتوں پر پانی ڈال رہا تھا، اکنی پر پانی چھڑکا۔ اس طرح سے سکّے کو پاک کر کے اس نے اسے اٹھا لیا اور اپنے دوسرے پیسوں میں ڈال دیا۔ پھر اس نے لال لالٹین کا ایک پیکٹ اٹھا کر اسے اس طرح باکھا کی طرف پھینکا جیسے کوئی قصائی اپنی دکان پر منڈلاتے ہوئے کتے کی طرف ایک ہڈی پھینک دیتا ہے۔

باکھا نے نیچے سے پیکٹ اٹھا لیا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر اُس نے اسے کھول کر ایک سگرٹ نکالی۔ مگر اسے یاد آیا کہ وہ ماچس کی ڈبیا خریدنا تو بھول ہی گیا تھا۔ مگر اس میں

کمتری کا اتنا احساس تھا کہ اس میں واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی جیسے کسی اندرونی جذبے نے اسے آگاہ کر دیا ہو کہ وہ بھنگی کا لڑکا تھا، اور اسے لوگوں کے سامنے کم سے کم آنا چاہیئے۔ کسی بھنگی یا کمین کا کھلے طور پر سگرٹ پینا بھی ایک گناہ سمجھا جاتا تھا۔ باکھا جانتا تھا کہ لوگ غریب آدمیوں کے امیروں کی طرح سگرٹ پینے کو سخت بے ادبی سمجھتے تھے۔ لیکن وہ تو سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ جب تک اس کے ہاتھ میں جھاڑو اور ٹوکری تھی اسے کوئی سگرٹ پیتا ہوا نہ دیکھے۔ اس جگہ، راستے کے دونوں طرف بہت سی نائیوں کی کھلی دکانیں بھی تھیں اور اس نے ایک مکان پر زمین پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے ایک مسلمان کو حقہ پیتے ہوئے دیکھا۔

"میاں جی" اُس نے اس سے درخواست کی "مہربانی کر کے اپنی چلم میں سے ایک کوئلہ نکال کر مجھے دیدو۔"

"اگر تو نے کوئلے سے اپنی سگرٹ سلگانی ہے تو جھک کر چلم میں ہی سلگا لے۔" حجام نے جواب دیا

باکھا کچھ ہچکچایا کیونکہ وہ کسی سے اس قسم کی ہمت کرنے کا عادی نہیں تھا، مسلمانوں سے بھی نہیں جنھیں ہندو نیچ سمجھتے تھے اور اس طرح وہ اس کے زیادہ قریب تھے۔ بہرحال اس نے جھک کر سگرٹ سلگا لی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑا خوش اور آزاد محسوس کیا اور وہ کش لگاتا ہوا اور اپنے نتھنوں سے سگرٹ کا دھواں باہر پھینکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ دھوئیں کے حلقے اس کے سامنے بنتے اور جلد ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ وہ بڑے انہماک سے سگرٹ پیتا رہا جو ہر لمحے چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس کا سفید اور گہرا سرخ آخری سرا بھی جل گیا۔

وہ شہر کے بڑے، اینٹوں کے بنے ہوئے گیٹ میں سے گزر کر بڑی سڑک پر آ گیا اور وہ رنگوں کے ایک سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ تقریباً ایک مہینے سے شہر نہیں آیا تھا۔ اسے ٹٹیوں پر کام کرنے سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ اس لیے وہ یہاں آتے ہی چاروں طرف سے لپکتی، دوڑتی، رنگ و بو کی دنیا میں بہہ سا گیا۔ وہ ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کے کنارے کنارے ہوتا ہوا بڑھتا رہا۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف دکانیں تھیں جن کے آگے کپڑے یا پٹ سن کے بڑے بڑے سائبان بانسوں کے سہارے دھوپ

سے بچنے کے لیے لگائے ہوئے تھے۔ دکانوں کے اوپر گنبد دار چھجے تھے۔ وہ ان دکانوں میں بکتی ہوئی اشیا اور چلتے پھرتے لوگوں کی بھیڑوں کو دیکھنے میں بری طرح مصروف ہوگیا۔ اِس بازار میں اس کا سب سے پہلا احساس مہک اور بُو کا تھا۔ بہت سی ناخوشگوار اشیا سے بھی ایک میٹھی سی مہک آ رہی تھی جیسے نالیاں، اناج، تازہ اور سڑتی ہوئی سبزیاں مصالحے، مرد اور عورتیں اور ہینگ۔ رنگوں کا تنوع اور امتزاج لاثانی تھا۔ پشاوری پھل فروش کی دکان پر ٹوکریوں میں رکھے ہوئے ڈھیروں سرخ، نارنجی اور گلابی رنگ کے پھل۔ پھل والا نیلی ریشمی پگڑی، سرخ مخمل کی واسکٹ جس پر سنہری زردوزی کا کام کیا ہوا تھا، لمبا سفید کرتہ اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس کے برابر ہی قصائی کی دکان پر سرخ رنگ کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ وہ خود لکڑی کے ایک گٹھے پر گوشت کا قیمہ کاٹ رہا تھا۔ اس کے دو کام کرنے والے آدمی گوشت کو لوہے کی سینکھوں پر چڑھا کر دہکتے کوئلوں پر سینک رہے تھے یا چپٹی لوہے کی کڑاہیوں میں بھون رہے تھے۔ اناج کی دکان پر گیہوں کا خشک زرد رنگ اور مٹھائی کی دکان پر طرح طرح کی مٹھائیوں کی قوسِ قزح۔ پگڑیوں اور لہنگوں کے مختلف رنگوں کا تو کہنا ہی کیا۔ بیواؤں کے کالے کپڑوں سے لے کر نئی نویلی دلہنوں کا سبزئی، گلابی، سرخ اور نارنجی رنگ کا جوڑا اور گزرتی ہوئی تغیر پذیر بھیڑوں کے ان گنت رنگ، برہمن کے سفید کپڑوں سے، گھسیاروں کے سفیدی ملے سیاہ کپڑوں اور پٹھان کے سیاہی مائل سرخ کپڑوں تک۔

باکھا نے کچھ دیر تک اپنے آپ کو گھبرایا ہوا سا، اور کھویا ہوا محسوس کیا پھر اس نے ایک دوسرے کو دھکا دیتی ہوئی اور لہر در لہر امڈتی ہوئی بھیڑ پر سے اپنی نظریں ہٹا کر خوبصورتی سے سجی ہوئی دکانوں کو دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں میں ایک بچوں کا تجسس اور اشتیاق تھا۔ کبھی وہ چوب تراش کی مہارت میں کھو جاتا اور کبھی درزی کی مشین چلانے کی استادی پر۔ اس کے دل میں ہر اُس نظارے کو دیکھ کر جو اگرچہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا مگر پھر بھی نیا تھا کوئی جذبہ آواز دیتا۔ " واہ خوب، واہ واہ"۔ گنیش ناتھ بنیئے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ چھوٹے قد کا ایک کمینہ اور بدزبان آدمی تھا جس کے آٹے سے بھری ہوئی بوریوں، کھانڈ اور سوکھی مرچوں، مٹرا ور گیہوں کی بھری ہوئی بوریوں کی اونچی دیواروں کے سامنے وہ ذرا سی چھاچھ اور نمک مانگنے بیٹھ گیا تھا۔ بنیئے نے

جوں ہی باکھا کو دیکھا باکھا جانے کے لیے کھڑا ہو گیا کیونکہ اس کے باپ کا اور بنیئے کا حال ہی میں جھگڑا ہو چکا تھا۔ اس کے باپ لاکھا نے جب اس کی ماں کے مرنے پر اس کے چاندی کے زیور کفن دفن اور دوسری رسموں کے اخراجات کے لیے اس کے پاس گروی رکھے تھے تو گنیش نے اس سے سود در سود مانگا تھا۔ وہ ایک ناخوشگوار معاملہ تھا اور باکھا اسے بھولنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر اسی غیر محسوس مسرت کے ساتھ بزاز کی دکان پر پہنچا۔ بڑی توند والا یہ لالہ جس نے سفید براق ڈھیلا ڈھالا ململ کا کرتہ اور دھوتی پہنی ہوئی تھی جھکا ہوا اپنی لال رنگ کی بہی میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا اور اس کے دو آدمی مانچسٹر میں بنے ہوئے کپڑے کے تھان کے تھان ایک گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے کو دکھا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کپڑے کی مضبوطی اور خوبصورتی کا ذکر ایک دوسرے سے بھی کرتے جا رہے تھے تا کہ ان گاؤں والوں پر اثر پڑے اور وہ خرید لیں۔ باکھا کو وہ گرم کپڑے بہت اچھے لگے جو دکان کے کونوں میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ اسی قسم کے کپڑے تھے جن کے صاحب لوگ اپنے سوٹ سلواتے تھے۔ دوسرے کپڑے جو ان دیہاتیوں کے آگے پڑے تھے، باکھا کے تصور میں کرتوں اور تہمدوں میں بدلنے لگے؛ لیکن یہ سب اس کی نظروں میں سمانے والا نہیں تھا۔ ہاں وہ اونی کپڑا تو کتنا چمکدار اور عمدہ تھا اور قیمتی معلوم ہو رہا تھا۔

یہ بات تو نہیں تھی کہ اس کا اس کپڑے کو خریدنے کا ارادہ تھا یا اسے کوٹ پتلون پہننے کی امید تھی۔ لیکن اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس میں پیسوں کو ضرور محسوس کیا یہ جاننے کے لیے کہ کیا اس کے پاس اس کپڑے کو قسطوں میں خریدنے کی صورت میں پہلی قسط ادا کرنے کے لیے کافی پیسے تھے۔ جیب میں تو صرف آٹھ آنے تھے۔ اسے یاد آیا کہ اس نے بابو کے بیٹے کو انگریزی کا سبق دینے کے لیے پیسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ سڑک پر آگے بڑھ کر بنگالی مٹھائی بیچنے والے کی دکان پر پہنچ گیا۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے بڑے موٹے حلوائی کے برابر رکھی ہوئی چاندی کے ورق لگی برفی کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "میری جیب میں آٹھ آنے ہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کیا تجھ میں مٹھائی خریدنے کی ہمت ہے؟ اگر باپو کو پتہ لگ گیا کہ میں اپنا تمام

پیسہ مٹھائیوں میں خرچ کرتا ہوں ؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے سوچا "لیکن چل یار! مجھے ایک ہی زندگی تو جینی ہے" وہ بولا "تھوڑی سی مٹھائی کھا لیتا ہوں، کون جانتا ہے کل زندہ رہوں یا نہیں۔" ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس نے چوری چوری دکان پر یہ دیکھنے کے لیے نظر ڈالی کہ کون سی مٹھائی سب سے سستی ہوگی جسے وہ خرید سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں عمدہ عمدہ مٹھائیوں پر دوڑتی رہیں' رس گلے، گلاب جامن اور لڈو۔ وہ سب بڑی مزیدار' رس میں ڈوبی ہوئی اور خوشنما مٹھائیاں تھیں اور اسے پتہ تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں سستی نہیں ہوں گی، کم از کم اس کے لیے تو نہیں کیونکہ دکاندار ہمیشہ بھنگیوں اور غریب لوگوں کو ٹھگتے تھے اور انھیں چیزیں کہیں زیادہ مہنگے داموں پر بیچتے تھے، شاید اس بات کے خیال سے کہ نچلی ذات کے لوگوں سے بیوپار کرنے میں ان کے بھرشٹ ہونے کا ڈر تھا۔ اس کی نظر جلیبیوں پر پڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ جلیبی تو سستی ہوتی ہیں۔ وہ انھیں پہلے خرید چکا تھا۔ اسے ان کا بھاؤ بھی پتہ تھا۔۔۔ ایک روپے کی سیر بھر۔

وہ ہمت کر کے اُس کونے سے جہاں وہ کھڑا تھا آگے بڑھ کر دکاندار کے سامنے آ گیا اور مدھم آواز میں بولا۔ "چار آنے کی جلیبی۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا بلکہ شرم بھی آ رہی تھی کہ لوگ اسے جلیبی خریدتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

حلوائی اس بھنگی کے کم ظرف شوق پر ہلکے سے مسکرا دیا کیونکہ جلیبی ایک سستی مٹھائی ہوتی ہے اور عام طور پر نچلی ذات کے لالچی آدمیوں کے سوا کوئی دوسرا آدمی چار آنے کی جلیبی نہیں خریدتا۔ لیکن وہ تو دکاندار تھا۔ اس نے ایک لاپرواہی دکھائی اور تیزی سے اپنی ترازو کو اٹھا کر' ایک پلڑے میں کچھ پتھر کے ٹکڑے اور گول گول لوہے کے بٹے رکھے اور دوسرے میں جلیبی ڈالی۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے ترازو کو رسّی سے پکڑ اٹھایا اور ہاتھ کی ایک تیز جنبش سے دونوں پلڑوں کو صرف ایک لمحے کے لیے برابر کر کے انگریزی اخبار "ڈیلی میل" کے ایک پرانے پرچے میں سے تھوڑا سا کاغذ پھاڑ کر جلیبیاں اس میں لپیٹ دیں۔ بے چارہ باکھا حیران اور دنگ رہ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حلوائی نے ڈنڈی مار کر جلیبیاں اسے کم دی تھیں۔ لیکن اس میں شکایت کرنے کی

ہمت کیسے ہو سکتی تھی۔ اس نے جلیبیاں پکڑیں جو حلوائی نے کرکٹ کی گیند کی طرح اس پر پھینکی تھیں اور اس نے چار آنے ایک باہر نکلے ہوئے تختے پر جس پر پاؤں رکھ کر دکاندار کا آدمی دکان پر چڑھتا تھا رکھ دیں اور حلوائی کے آدمی نے ان پر فوراً پانی چھڑک کر انھیں اٹھا لیا۔ باکھا کچھ پریشان سا مگر خوش خوش آگے بڑھ گیا۔

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے جلیبیوں والے کاغذ کو کھولا اور ایک موٹا سا ٹکڑا اٹھا کر جلدی سے منہ میں رکھ لیا۔ گرم اور میٹھے رس کا ذائقہ بہت عمدہ اور تسلی بخش تھا۔ اس نے پھر کاغذ کھولا اور پوری جلیبی منہ میں ڈال لی کیونکہ اس نے سوچا کہ پورا منہ بھر کر ہی مزہ آئے گا اور اسی صورت میں وہ جلیبی کا پورا ذائقہ حاصل کر سکے گا۔ اس طرح بازار میں چل کر، مٹھائی کھاتے ہوئے اور چیزیں دیکھ کر اسے کتنا مزہ آ رہا تھا۔ دکانوں کی اوپر کی منزلوں سے بڑے بڑے سائن بورڈ جن پر بڑے بڑے حروف میں تاجروں، وکیلوں اور ڈاکٹروں کے نام اور ان کے پیشوں کی ڈگریاں تک لکھی ہوئی تھیں، نیچے باکھا کو جھانک رہے تھے۔ اس نے سوچا کاش وہ ان تمام عمدگی سے پینٹ کیے ہوئے بورڈوں کو پڑھ سکتا۔ لیکن اسے اس خیال سے تسلی ہوئی کہ اس نے اپنی انگریزی کی پڑھائی کا انتظام تو آج دوپہر کے بعد سے کر ہی لیا تھا۔ پھر اس کی نظر کھڑکی میں بیٹھی ہوئی ایک عورت کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ایک احساسِ بے خودی میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

"او نیچ ذات کے کیڑے، ایک طرف کو ہو کر چل" اس نے پیچھے سے کسی کو چلاتے ہوئے سنا "سور کے بچے تُو آواز دے کر آگے کیوں نہیں چلتا تاکہ لوگوں کو تیرے آنے کا پتہ لگ جائے؟ ابے اندھے، بچھو کی اولاد کیا تجھے پتہ ہے کہ تو نے مجھے چھو کر بھرشٹ کر دیا ہے؟ اب مجھے گھر جا کر اشنان کر کے اپنے آپ کو پاک صاف کرنا پڑے گا۔ اور آج صبح ہی میں نے نئی دھوتی اور قمیض پہنی تھی۔"

باکھا حیران، پریشان کھڑا تھا۔ وہ بہرا اور گونگا تھا جیسے اس پر لقوا مار گیا ہو۔ اسے ایک خوف اور غلامی کے جذبے نے جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ اس قسم کا سلوک تو ہوتا ہی رہتا تھا لیکن کبھی وہ ایسی بے خبری میں نہیں پکڑا گیا۔ اس کے ہونٹوں پر وہ عجیب سی عاجزی کی مسکراہٹ جو اونچی ذات کے لوگوں کی موجودگی میں ہمیشہ رہتی تھی اب اور

بھی نمایاں ہو گئی۔ اس نے اپنا چہرہ اس آدمی کے سامنے اٹھایا مگر اس کی نظریں جھکی رہیں۔ اس نے جلدی سے اس آدمی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ اس کی گرم اور سرخ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"سور تونے آواز دیکر اپنے آنے سے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا؟" وہ باکھا کی نظریں ملتے ہی چلا کر بولا "او جنگلی کیا تجھے پتہ نہیں کہ تو مجھے نہیں چھو سکتا؟"

باکھا کا منہ کھل گیا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ معافی مانگنے والا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر اپنا سر جھکایا اور کچھ بڑبڑایا۔ لیکن اس آدمی نے اِس بات کی پرواہ نہیں کی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ باکھا اس تناؤ بھرے ماحول میں اتنا گھبرا گیا تھا کہ نہ اسے اپنی بات کو دہرانے کی سوجھی اور نہ سنبھل کر ٹھیک طرح صاف بولنے کی۔ آدمی کی اس کے گونگے عجز سے تسلی نہیں ہوئی — "گندے کتے، کتیا کی اولاد، سور کے بچے!" وہ پھر چلایا۔ غصے کے مارے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور وہ اتنے زور سے بول رہا تھا کہ اس کی الفاظ کی ادائیگی پر بھی فرق پڑ رہا تھا۔ "مجھے جا۔ جانا۔ پڑے گا۔ بیں، بیں کام پر جا رہا تھا اور اب، اب تیری وجہ سے مجھے دیر ہو جائے گی!"

ایک آدمی جاتا جاتا یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ کیا معاملہ تھا۔ یہ ایک سفید پوش آدمی تھا اور اپنے لباس کی وضع قطع سے کوئی امیر ہندو بیوپاری معلوم ہوتا تھا۔ اس آدمی نے کسی مظلوم کی طرح اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے اور اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو جو سانپ کی طرح پھنکار رہے تھے بند کرتے ہوئے اپنا سارا معاملہ اِس کے سامنے رکھا۔

"یہ گندا کتا سیدھا مجھ سے ٹکرا گیا۔ یہ کتیوں کے پلّے اتنی لاپرواہی سے سڑکوں پر پھرتے ہیں۔ یہ سُور اپنے آنے کے بارے میں بغیر آواز دیئے چلا آ رہا تھا!"

باکھا ساکت کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اگرچہ وہ کبھی کبھی اپنا چہرہ اٹھانے کی ہمت کر لیتا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا اور ناامیدی اور بے چارگی کے بے اثر اظہار نے اُس میں کئی شکنیں ڈال دی تھیں۔

کچھ دوسرے آدمی بھی یہ دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے کہ کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا

اور چوں کہ ہندوستانی سڑکوں پر پولیس والے تو شاذ ہی نظر آتے ہیں، پیدل چلنے والوں نے رک کر ایک گھیرا سا بنا لیا۔ پولیس والے بڑے رشوت خور ہوتے ہیں کیونکہ ان کی بھرتی "چور کو پکڑنے کے لیے چور کو چھوڑ دو" کے اصول پر کی جاتی ہے۔ لوگوں نے اپنا دائرہ باکھا سے کئی گز دُور ہٹ کر بنایا تھا لیکن سب کے سب شکایت کرنے والے آدمی کی مدد کرنے اور باکھا کو برا بھلا کہنے میں اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ غریب باکھا سڑک کے عین بیچ میں کھڑے ہونے کی وجہ سے اور بھی گھبرا گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ ایک دفعہ تو اس نے سوچا کہ وہ اس بھیڑ کو چیرتا ہوا اس غیظ و غضب سے بچ کر دور بھاگ جائے لیکن وہ تو ایک بندش میں پھنسا ہوا تھا، لوگوں کی بندش نہیں بلکہ ایک اخلاقی بندش۔ پہلی بندش کو تو وہ آسانی سے اپنے مضبوط کندھوں کے ایک دھکے سے توڑ سکتا تھا۔ آخر یہ لوگ کمزور جسموں کے ہندو دکاندار ہی تو تھے لیکن اگر وہ دھکا دے کر نکلا تو اس کے چھونے اِن میں سے بہت سے آدمی بھرشٹ ہو جائیں گے اور یہ سوچتے ہی اس کے کانوں میں وہ گالیاں گونجنے لگیں جو ایسا کرنے سے اس پر پڑیں گی۔

"کیا آپ کو نہیں پتہ کہ اس دنیا کا کیا ہونے والا ہے۔ یہ سور زیادہ بدماغ ہو رہے ہیں" ایک پست قد بوڑھے نے کہا۔ "اس کا ایک بھائی جو میرے گھر کی ٹٹی صاف کرتا ہے ایک دن کہنے لگا کہ ایک روپیہ مہینہ اور ہر روز کی روٹی کی بجائے وہ اب دو روپے ماہوار اور روٹی لے گا۔"

"یہ ایک لاٹ صاحب کی طرح چل رہا تھا جیسے لفٹنٹ گورنر ہو۔" بھرشٹ آدمی چلّایا "لوگو ذرا سوچو اور اس کی گستاخی دیکھو۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں" ایک پتلا دبلا بوڑھا بولا "پتہ نہیں یہ کلجگ کا زمانہ ابھی اور کیا کیا تماشے دکھائے گا!"

"جیسے یہ ساری سڑک اس کی جاگیر تھی!" بھرشٹ آدمی پھر چلایا۔ "کتے کی اولاد۔"

سڑک کے بہت سے لڑکے لوگوں کی ٹانگوں میں سے گھس کر تماشہ دیکھنے کے لیے آگے آ گئے تھے۔ ایک لڑکے نے شکایت کرنے والے آدمی کی بات سے اشارہ

ہانپتے ہوئے کہا — "او کتّے کے پلّے اب بتا تجھے کیسا لگ رہا ہے۔ تو تو ہمیں مارا کرتا تھا۔"

"دیکھا لوگو، تم نے دیکھا" وہ بھرشٹ آدمی بولا "یہ چھوٹے معصوم بچوں کو بھی مارتا رہا ہے۔ یہ پکّا بدمعاش ہے۔"

باکھا ابھی تک گونگا بنا ہوا کھڑا تھا لیکن اِس بچّے کے جھوٹ بولنے پر اس کی ایمانداری اپنے بچاؤ میں بول اٹھی۔

"میں نے کب تجھے مارا؟" اس نے بچّے سے غصّے سے پوچھا

"دیکھ رہے ہیں آپ اِس کی گستاخی؟" وہ آدمی چلّایا "اب یہ زخم پر نمک چھڑک رہا ہے۔ دیکھا صاف جھوٹ بول رہا ہے۔"

"نہیں لالہ جی یہ سچ نہیں ہے کہ میں نے اِس کو کبھی مارا۔ یہ بالکل سچ نہیں ہے۔" باکھا گڑگڑایا۔ آج ضرور مجھ سے غلطی ہوئی ہے کہ میں آتے ہوئے آواز لگانا بھول گیا۔ میں اس کے لیے معافی مانگتا ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں بھول گیا۔ مجھے معاف کردو۔ پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

لیکن بھیڑ اس کی طرف گھورتی، بھینچتی، چلّاتی، مذاق اڑاتی اور تھوتھو کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ کسی میں بھی اُس کے اور اُس کے دُکھ کے لیے رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اُن میں سے کسی پر بھی اس کے گڑگڑا کر معافی مانگنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو اُس آدمی کی لگاتار گالیوں کی بوچھاڑ تلے دبتے ہوئے باکھا کو دیکھ کر لطف لے رہے تھے۔ جو لوگ خاموش کھڑے تھے وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے غصّے میں، جو وہ زور زور سے بول کر کر رہے تھے، اپنے ہی جذبے اور خیالات کا اظہار محسوس کر رہے تھے۔

باکھا کے لیے ہر لمحہ ایک نہ ختم ہونے والا دکھ اور عذاب کا ایک لمبا عرصہ نظر آرہا تھا۔ وہ بڑی عاجزی سے جھکا ہوا کھڑا تھا اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ سی رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گر پڑے گا۔ اسے اپنی غلطی پر واقعی بڑا افسوس تھا اور اس نے اپنے ستانے والوں سے سچے دل سے معافی مانگ لی تھی۔ لیکن اس فاصلے نے جو بھیڑ نے اپنے اور اس کے درمیان قائم کردیا

تھا اس کے وہاں سے نکل جانے کے جذبے کو روک دیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا ہوا ان کے قہر اور زہریلی پھنکاروں کو سنتا رہا۔ " لاپرواہ اور غیر ذمے دار' سور کہیں کے"" یہ لوگ اب کام کرنا نہیں چاہتے"۔ "یہ شُستی سے گھومتے پھرتے ہیں۔" انھیں اس دنیا سے مٹا دینا چاہیئے"۔

باکھا کی قسمت سے کوئی تانگے والا آگیا اور اس نے اپنی کمزور بوڑھی گھوڑی کو ہنٹر مارا اور گھوڑی ہانک کر ادھر اُدھر دوڑتی ہوئی بھیڑ کی طرف بڑھی۔ تانگے والے کے پاس کوئی گھنٹی یا بھونپو نہیں تھا اور اس نے چلّا کر بھیڑ کو ہٹ جانے کی تنبیہ دی۔ ساتھ ہی حادثے کو بچانے کے لیے اس نے گھوڑی کو زور سے لگام کھینچ کر روک لیا۔ بھیڑ تتر بتر ہوگئی اور ہر بھاگتے ہوئے آدمی نے اپنی عمر اور مزاج کے مطابق گالیاں دیں یا آوازیں نکالیں اور چلّائے۔ جس آدمی کو باکھا نے چھو دیا تھا اس کا غصّہ ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ وہ آدمی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ وہ بڑھتے ہوئے تانگے کے سامنے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے گا لیکن کئی سالوں میں اسے یہ پہلا موقع ملا تھا کہ اپنی طاقت دکھائے۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ ۴ فٹ ۱۰ انچ کا جسم اس کی طاقت کے جھوٹے جذبے نے جو اس نے ایک مجبور اور عاجز بھنگی لڑکے کے خلاف اپنے سخت رویّے سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی' ایک بڑی قد آور شخصیت میں بدل دیا تھا۔

" بچنا لالہ جی "، تانگے والا اس گستاخی سے چلّایا جو اس کے پیشے کی خصوصیت تھی۔ بد سرشت آدمی نے اسے غصّے اور بے صبری سے دیکھا اور اسے ہاتھ ہلا کر ٹھہرنے کو کہا۔

" لالہ جی میری طرف یہ آنکھیں نکال کر نہ دیکھنا " تانگے والے نے جواب میں کہا اور وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک زور سے اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔

" تو نے مجھے چھوا ہے " اس نے لالہ کو باکھا سے کہتے ہوئے سنا " مجھے اب نہا کر اپنے آپ کو پاک کرنا پڑے گا۔ سور کے بچے تیری بدمعاشی کا یہی انعام ہے "۔ اور تانگے والے نے ہوا میں لہراتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ کی آواز سنی۔

باکھا کی پگڑی گر پڑی اور کاغذ میں بندھی ہوئی اس کی جلیبیاں اس کے ہاتھ سے

گر کر مٹی میں بکھر گئیں۔ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ پھر اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس کے ہاتھ بھی اب جڑے ہوئے نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے اور اس کے گالوں سے نیچے ڈھلک پڑے۔ اُس کی آنکھوں میں بدلے کی خواہش تھی اور اس خواہش سے اس کی طاقت اور اس کے مضبوط جسم کی قوت پھڑ پھڑا رہی تھی۔ غیض و غضب اس کے تمام جسم میں سرایت کر گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اپنا انکسار کھو دیا اور شاید وہ غصے سے بھڑک بھی اٹھتا لیکن وہ آدمی جس نے اسے تھپڑ مارا تھا کھسک گیا تھا اور سڑک کی بھیڑ میں اب اس کی پہنچ سے باہر ہو چکا تھا۔

"چھوڑ اسے، کوئی بات نہیں۔ جانے دے اسے۔ آ میرے ساتھ۔ اپنی پگڑی باندھ لے" تانگے والے نے باکھا کو تسلی دی۔ وہ ایک مسلمان تھا اور قدامت پسند ہندو نظریے کے مطابق وہ بھی ایک اچھوت تھا۔ اِس لیے اس نے کچھ حد تک باکھا کے غم اور غصے میں ہمدردی دکھائی۔

باکھا جلدی سے ایک طرف ہو گیا اور اپنی جھاڑو اور ٹوکری کو نیچے رکھ کر اپنی پگڑی باندھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور ٹوکری اور جھاڑو اٹھا کر چلنا شروع کر دیا۔

"او حرام کے پلّے کی اولاد اب آواز دینا نہ بھولیو" ایک دکاندار ایک طرف سے بولا "اگر تجھے واقعی آج سبق مل گیا"

باکھا تیزی سے بڑھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ہر ایک آدمی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے دکاندار کی گالی برداشت کر لی اور چلتا رہا۔ کچھ آگے چل کر وہ آہستہ ہو گیا اور اپنے آپ زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ "پوش، بچو، ہٹو، پوش، بھنگی آرہا ہے، پوش پوش، بھنگی آتا ہے۔ پوش پوش، بھنگی آرہا ہے"!

لیکن ایک سلگتا ہوا غصہ اس کی روح میں ابھر آیا تھا۔ اس کے جذبات ایسے اٹھ رہے تھے جیسے ادھ جلی آگ میں سے دُھواں۔ وہ چلتے چلتے غصے کے مارے کانپ سا رہا تھا۔ جب اسے وہ گالیاں، وہ ملامت یاد آتی جو اسے ملی تھی اور جس نے اس کے اندر غم اور غصے کی چنگاری پیدا کر دی تھی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ اس کے اندر غم اور غصے کی چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے دھندلے ذہن میں وہ لوگ ابھرنے لگے جو گھیرا

بناکراس کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ سب سے آگے اُس آدمی کی تصویر تھی جس کو اس نے چھو دیا تھا۔ وہ اس کی خونی آنکھیں، پچکے ہوئے گالوں والا چھوٹا سا جسم، سوکھے پتلے ہونٹ، اس کا غضب ناک سلوک، اور اس کی گالیاں، سب کچھ محسوس کر سکتا تھا اور اُس گالی دیتی ہوئی، چیختی ہوئی اور برا بھلا کہتی ہوئی بھیڑ کو بھی جس کے بیچ میں وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ "ایسا کیوں ہوا؟" اس نے اپنے آپ سے اپنے دل میں سوال کیا جیساکہ وہ آواز کیے بغیر اکثر کیا کرتا تھا، "یہ سب جھگڑا کیوں ہوا۔ میں اتنا کیوں جُھک گیا۔ میں اسے مار سکتا تھا اور پھر میں تو خود آج صبح شہر میں آنے کے لیے اتنا خواہشمند تھا۔ میں نے چلّا کر لوگوں کو اپنے آنے کی تنبیہ کیوں نہیں دی۔ یہ کام ٹھیک طرح نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ مجھے سڑکیں صاف کرنے کا کام شروع کردینا چاہیئے تھا۔ مجھے بازار میں اونچی ذات کے لوگوں کو دیکھ کر چلّانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ آدمی، اس نے تو مجھے مارنے کی ہمت کی۔ میری جلیبیاں بھی گر گئیں۔ مجھے انھیں کھا لینا چاہیئے تھا۔ لیکن میں کچھ بول کیوں نہیں سکا۔ کیا میں اِس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو میرے تھپڑ مارا۔ بزدل کہیں کا، وہ کیسے بھاگ گیا، بالکل کتّے کی طرح اپنی دم ٹانگوں میں دبا کر۔ اور وہ بچّہ، جھوٹا کہیں کا۔ کبھی میں اس سے ضرور بنٹوں گا۔ اسے پتہ تھا مجھے گالیاں پڑ رہی ہیں۔ کوئی بھی تو آدمی میری طرف سے نہیں بولا۔ کتنی ظالم بھیڑ تھی۔۔۔ سب نے ہی گالی دی۔ ہمیں ہمیشہ گالی ہی کیوں ملتی ہے؟ صاحب اور داروغہ صفائی نے بھی اُس روز میرے باپ کو گالی دی تھی۔ وہ ہمیشہ ہمیں گالی دیتے ہیں کیونکہ ہم بھنگی ہیں۔ کیونکہ ہم میلے اور گوبر کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ انھیں مَیلے سے نفرت ہے۔ میں بھی نفرت کرتا ہوں۔ اِس لیے سڑکیں صاف کرنے آیا تھا۔ میں ہر روز ٹٹیوں پر کام کرتے کرتے تنگ آگیا تھا۔ اِسی وجہ سے اونچی ذات والے لوگ ہمیں نہیں چھوتے۔ تانگے والا ایک مہربان آدمی تھا۔ جب اس نے مہربانی سے مجھے اپنی چیزیں اٹھانے اور ساتھ چلنے کے لیے کہا تو میں رونے لگا تھا۔ لیکن وہ مسلمان تھا۔ مسلمان اور صاحب لوگ ہمیں چھونے میں کوئی برائی نہیں سمجھتے۔ صرف ہندو اور چھوٹی ذات کے وہ لوگ جو بھنگی نہیں ہیں ہمیں نہیں چھوتے۔ اُن کے لیے تو میں ایک بھنگی اور اچھوت ہوں۔ اچھوت، اچھوت اور اچھوت یہ ہے وہ لفظ اچھوت۔ میں ایک اچھوت ہوں۔"

جیسے کسی روشنی کی کرن اندھیرے میں لپکتی ہے اسے اپنی اہمیت اور اپنے پیشے کا

احساس ہوگیا۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں روشنی سی ہوئی ان باتوں کی جو آج اس پر بیتی تھیں۔ وہ اس روشنی تک پہنچنا چاہتا تھا اور اسے جواب مل گیا۔ جو لوگ روزانہ ٹٹیوں میں آتے تھے وہ ہی اس سے نفرت کرتے تھے اور شکایت کرتے تھے کہ ٹٹیاں صاف کیوں نہیں ہوئی تھیں۔ نچلی ذات کے لوگوں کی بستی میں لوگوں کی ان سے نفرت اور آج صبح بھیڑ کی گالیاں، سب کچھ اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ اب تک وہ بے حس، بے جان سا تھا لیکن آج کے صدمے نے اسی بری طرح جھنجوڑ دیا تھا اور اس کی سننے، سونگھنے، چھونے اور ذائقے کی تمام حسیں بیدار ہوگئی تھیں "میں ایک اچھوت ہوں۔" وہ اپنے آپ سے بولا "ایک اچھوت"! اس نے ان لفظوں کو اپنے ذہن میں دہرایا کیونکہ ابھی تک اس کا ذہن صاف نہیں تھا اور اسے خدشہ تھا کہ ایک دفعہ پھر اس کے ذہن کے سامنے تاریکی چھا جائے گی۔ اسے پھر احساس ہوگیا کہ وہ تو ایک بھنگی ہے اور اس نے زور زور سے اپنے تنبیہ کے لفظ کو بولنا شروع کردیا جس سے وہ اپنی آمد کا اعلان کیا کرتا تھا۔ "پوش، پوش، بھنگی آرہا ہے۔" اچھوت، اچھوت کی گردان وہ اپنے دل میں کر رہا تھا مگر "پوش، پوش، بھنگی آرہا ہے" کے الفاظ وہ اپنے منہ سے کہہ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا اور جلد ہی وہ ایک سپاہی کی طرح، جس کے لیے اس کے فوجی بوٹ اتنے آرام دہ تھے، چلنے لگا لیکن اس نے دیکھا کہ اُس کے بوٹوں کی آواز تو لوگوں کی توجہ کھینچ سکتی تھی، اِس لیے وہ پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

باکھا کو احساس ہوا کہ لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا کہ وہ اتنی توجہ کیوں کھینچ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی پگڑی کی تہہ کھل کر اس کے ماتھے پر گر رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک کونے میں جاکر اسے ٹھیک طرح سے باندھ لے۔ یہ سوچ کر کہ شاید اسے کوئی دیکھ لے، وہ بے دلی سے چلنے لگا۔ جیسے اس کے ذہن پر اپنے کام کو ختم کرنے کا بوجھ ہو، اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ بیوقوف ہے کیونکہ وہ بن رہا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی کھولی اور اسے اپنے سر کے گرد سختی سے لپیٹنے لگا۔

ایک رونق والی جگہ آگئی اور وہ رک گیا۔ اس کے اندر جلتی ہوئی آگ نے اس کے ذہن کو خالی کردیا تھا مگر اس کے اندر ایک تناؤ کی کیفیت تھی اور وہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔

اس کے پاس ہی ایک ابھری ہوئی پیٹھ اور چھوٹے سینگوں والا ایک بوڑھا برہمنی سانڈ ادھ کھلی آنکھوں سے پھر رہا تھا۔ جگالی کرتے ہوئے اس کے منہ سے بدبو آرہی تھی اور باکھا نے آج کوئی اور ایسی متلی لانے والی بدبو نہیں سونگھی تھی۔ ساتھ ہی اس کا گوبر نیچے گر رہا تھا۔ باکھا کا اس خیال سے ہی دل خراب ہوگیا کہ اِس گوبر کو صاف کرنا بھی اس کا کام تھا۔ لیکن اسی وقت اس نے ایک عمدہ لباس پہنے ہوئے جھریوں والے بوڑھے ہندو کو دیکھا جو ایک امیر آدمی کی طرح ایک ململ کا کپڑا اپنے بائیں کندھے پر ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اس جگہ کی طرف بڑھا جہاں سانڈ اپنی نیند کا لطف لے رہا تھا اور اس نے اپنی انگلیوں سے اسے چھوا۔ باکھا جانتا تھا کہ ہندو ایسا کرتے تھے۔ لیکن اِس کا کیا مطلب تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی یادداشت میں وہ منظر لوٹ آیا جو اس نے شہر میں بہت مرتبہ دیکھا تھا یعنی کوئی سانڈ یا بیل اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ کسی سبزی کی دکان کی طرف بڑھتے ہوئے اور سبزیوں کی بھری ٹوکریوں کو سونگھ کر اور منہ میں گوبھی، پالک اور گاجریں بھر کر بھاگتے ہوئے۔ دکاندار صرف ایک ہلکی سی گالی نکالتا تھا یا اسے ہاتھ اٹھا کر ڈراتا تھا، لیکن مارتا نہیں تھا۔ سانڈ ایک دو گز آگے دوڑ کر منہ میں بھری ہوئی سبزیوں کو چبا جاتا تھا اور پھر اسی دکان پر ٹوٹ پڑتا تھا جونہی وہ دکاندار اپنا سر دوسری طرف موڑ لیتا تھا۔ ”کتنی عجیب بات ہے کہ ہندو اپنی گایوں کو چارہ نہیں دیتے اگرچہ وہ گائے کو ماں کہتے ہیں“ باکھا نے سوچا۔ ”ان کے مویشی جو ندی کے کنارے چرنے جاتے ہیں کتنے مریل اور کمزور ہوتے ہیں۔ اُن کی گائے روزانہ دو سیر سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی۔“ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک امیر ہندو بیوپاری نے جسے بیٹوں کی خواہش تھی اور برہمنوں نے اسے کوئی مویشی دان دینے کے لیے کہا تھا تو اس نے اس کے باپ کو ایک بھینس دان میں دیدی تھی۔ وہ اس بھینس کو روزانہ دانہ کھلاتے تھے اور انھوں نے اس کی اتنی دیکھ بھال کی کہ وہ ایک دن میں بارہ سیر دودھ دیتی تھی اور یہ لوگ اپنی گایوں پر مہربان ہیں۔ سانڈ ہر روز ان کی پیاز اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ اِس ہی وجہ سے اُس سے بدبو آتی ہے۔“

ابھی تک وہ اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش کے ماحول سے دور رکھنے میں کامیاب رہا تھا لیکن ایک گاڑی جس پر شلغم اور گاجریں لدی ہوئی تھیں آئی اور زمین پر اتار کر

چل دی۔ وہ جلدی سے چند قدم آگے بڑھا لیکن گندی اور سڑتی ہوئی سبزیوں کا ایک ڈھیر یہاں رکھی ہوئی ٹوکریوں پر بکھر گیا۔ ان خراب سبزیوں کی گندی بد بو نے اسے تیزی سے پرے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی پلکیں جھپکائے بغیر اس نے چلتے چلتے خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بازار میں سخت گرمی اور بھیڑ تھی۔ اُس کو پسینہ آرہا تھا۔ اس کا چوڑا، صاف چہرہ، جو عام طور پر اتنا رحم دل، اتنا مختلف، اتنا تغیر پذیر تھا، اور جس کے گالوں کی اونچی ہڈیاں چمکدار رہتی تھیں، چپ چاپ اور سنجیدہ تھا جیسے اس پر مردنی چھائی ہو۔ یہی حال اس کی چوڑی ناک اور پھیلتے سکڑتے نتھنوں کا تھا جو کسی عربی گھوڑے سے ملتے تھے۔

"پوش، پوش بھنگی آتا ہے" اس نے آگے بڑھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اب وہ ایسے راستے پر تھا جو نہ کوئی وسیع اور مشہور سڑک تھی اور نہ ہی ایک تنگ گلی بلکہ دونوں کا ایک مرکب تھی۔ اس کے دونوں طرف جو اکا دکا دکانیں تھیں انھیں دیسی بینڈ بجانے والی کمپنیوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ لوگ کسی ریٹائرڈ آرمی بینڈ ماسٹر کی رہنمائی میں یوروپین ساز بجاتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں شادی اور سالگرہ کی پارٹیوں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ یہ ایک طرح کا چوراہا تھا جس کے بیچ میں ایک اکیلی آٹے دال کی اور ایک پان کی دکان تھی۔ پاس ہی ایک جدید آٹا پیسنے کی چکی بھی تھی جس میں وہ نفاست پسند پرانی ہندوستانی عورتیں آتی تھیں جنھیں موٹا آٹا پسند تھا اور جو دکانوں پر بکنے والے باریک آٹے کو ہضم نہیں کر سکتی تھیں، یا جو کفایت شعار تھیں اور اکٹھی گیہوں خرید کر پسوالیتی تھیں۔ ایک کونے میں، ایک بڑے اندھیرے کمرے میں ایک پرانی تیل نکالنے کی دکان بھی تھی۔ اِس میں کولھو پر جو چھت سے نیچے فرش کے بیچ میں بنا ہوا تھا ایک بیل سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ باکھا بچپن سے اس بازار کو جانتا تھا اور اس کے گڑھوں کا عادی تھا اور اس کی سیدھی بارکوں کی طرح کی شکل کی تعریف کرتا تھا۔ انگریزی موسیقی کے ساز اور سنہرے کام والی وردیاں جو بینڈ کی دکانوں پر اور خاص طور پر جہانگیر کی دکان پر جو شہر میں سب سے اعلیٰ بینڈ کا مشہور مالک تھا، لٹکی رہتی تھیں۔ یہ باکھا کے انگریزی پسند ذہن کو بڑی اچھی لگتی تھیں۔ اِس سڑک کی مقابلتاً خاموشی نے باکھا کو پہلے سے کافی بہتر بنا دیا۔ اس نے اِس کے مکانوں میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ اس نے اِس کے ماحول میں کم گھبراہٹ محسوس کی۔ بینڈ کی دکانوں میں پیتل کے ساز اور وردیاں اس کے ذہن کو واپس ۳۸ ڈوگرہ رجمنٹ کے ملٹری بینڈ کی طرف لے گئیں جسے وہ ہر روز چھاؤنی

میں مشق کرتے دیکھتا تھا۔ اس کا غم کچھ کم ہوگیا اور اس نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا اور اُس بے عزتی اور صدمے کو قدرے بھول گیا جو آج اس نے سہا تھا۔

اِس خاموش سڑک سے نکل کر وہ ایک مکان کے نیچے سے کونے پر مڑ گیا جو شاہراہ سے مل جاتا تھا اور وہ اُن دکانوں کی لائینوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا جہاں سستے سفید نِکل کے زیورات پر بجلی کی مشین سے پالش کی جاتی تھی۔ جب باکھا بچہ تھا تو اس نے اکثر اپنی انگلیوں میں انگوٹھیاں پہننے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی ماں چاندی کے زیورات سے سجی رہے۔ اب جب وہ انگریزوں کی بارکوں میں جا چکا تھا اور اسے پتہ لگ گیا تھا کہ انگریز زیور پہننا پسند نہیں کرتے تو اسے بھی ہندوستانیو ں کے جڑاؤ اور پھول دار ڈیزائن کے زیورات سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ دکانوں پر سناروں کے ہرے کاغذ پر سجائے ہوئے دمکتے زیور، کانوں کے بڑے بڑے کانٹے، ناک کی لونگیں، بالوں کے پھول اور سونے کے ملمّع شدہ زیورات کی طرف دھیان دئے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ سڑک کے عین بیچ میں ایک کپڑوں کے ٹکڑے بیچنے والا جس نے اپنے ٹکڑے ایک تین پہیوں کی صندوق نما گاڑی میں رکھے ہوئے تھے کچھ سفید کپڑے پہنے ہوئی عورتوں سے قیمت پر بحث کر رہا تھا۔ باکھا کچھ دیر رک گیا کہ شاید یہ کپڑے والا عورتوں سے نبٹ کر آگے بڑھ جائے اور راستہ صاف ہو جائے۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور وہ مزید آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہ کھڑے ہو کر ہندو دیوی دیوتاؤں کی جرمنی میں چھپی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا جنھیں ایک سِکھ کاریگر قیمتی نظر آنے والے لکڑی کے فریموں میں لگاتا جا رہا تھا۔ مگر ایک انگریز میم کی تصویر پر جو بہت کم کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں ایک پھول تھامے لیٹی ہوئی تھی باکھا کی نظر جم گئی۔ دکاندار نے اس کے ہاتھوں میں جھاڑو اور ٹوکری دیکھ کر اس کو غصے کی نظروں سے دیکھا اور اسے آگے بڑھنے کو کہا۔ بھنگی کے لڑکے نے اپنا منہ اٹھایا اور "پوش، پوش، بھنگی آتا ہے" کہتا ہوا خریداروں کی اُس بھیڑ کی طرف بڑھا جو کٹ پیس کے کپڑے بیچنے والے کے گرد اکٹھی ہو گئی تھی۔ گاہک کپڑوں کے ٹکڑوں کو کھینچ رہے تھے اور زور زور سے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے اور بڑی مشکل سے جھنجلائے مسلمان دکاندار نے اپنے کپڑے گاہکو ں سے چھینے۔ اس نے انھیں آنے والے اچھوت کی بھی آگاہی دی۔ جب دکاندار ان سے کپڑے لینے اور بھنگی کے آنے کے بارے میں

خبردار کرنے میں کامیاب ہوگیا تو بولتی، کاناپھوسی کرتی، ناراض، خوش اور اداس بھیڑ باکھا کے آگے آگے تتر بتر ہوگئی لیکن تھوڑی دور پر چوڑی بیچنے والے آدمیوں کے پاس کھڑی ہوگئی جو اپنی چوڑیوں کو کھنکا کھنکا کر عورتوں کی اور خاص طور پر نئی نویلی دلہنوں کی توجہ کھینچ رہے تھے۔

یہ دلہنیں اپنی ماؤں اور ساسوں کے پیچھے اپنے زرق برق سنہری کام کے کرتوں اور بنارسی لہنگوں میں مندر کی طرف جا رہی تھیں جس طرف باکھا بھی جا رہا تھا۔ وہ اکتا کر پھر بولا ـ "پوش پوش بھنگی آتا ہے" لیکن شوقین اور جوشیلی عورتیں پچھلی دکان پر دکان دار کے برا بھلا کہنے کو بھول چکی تھیں اور اپنی چھاتیوں کو زور زور سے ہلاتی ہوئیں باتوں میں اتنی مست تھیں کہ انہوں نے باکھا کی آواز کو نہیں سنا حتیٰ کہ اسے پھر زور سے چلانا پڑا۔

آخر کار ان عورتوں نے اسے راستہ دے دیا اور باکھا کے سامنے مندر کی بڑی شاندار، پتھر کی بنی ہوئی کلس دار عمارت نظر آنے لگی جس پر طرح طرح کی نقاشی، پھول پتی اور باریک آرائشی کام کیا ہوا تھا۔ مندر کو دیکھتے ہی ایک عجیب سا خوف اس میں بھر گیا۔ باکھا اس خوف پر پہلے بھی کبھی قابو نہیں پا سکا تھا اور یہ شاید اس عزت کی وجہ سے تھا جو بچپن سے ہی اس کے دل میں ہندوؤں کے ۱۲ سر اور ۱۰ ہاتھ والے دیوی، دیوتاؤں کے لیے تھی یا پیدا کر دی گئی تھی۔ اور جونہی اس نے صحن میں چلتے ہوئے اس اونچی دیوار کے سایے سے اوپر دیکھا تو وہ ایک عجیب نامعلوم طاقت سے متاثر ہوا جو اس مندر میں چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے اس جگہ پر سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ سلیٹی رنگ کے کبوتر اڑے اور ان خالی آلوں میں بیٹھ گئے جو جگہ جگہ مندر کی کھدائیوں میں بنے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی ایک ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور ان کے غٹر غوں کرنے کی آواز اس کے ہیجان کو تسکین دے رہی تھی۔ اس نے ایک بھنگی کے احساس سے سارے صحن کا معائنہ کیا اور کبوتروں کی بیٹ، پھولوں اور پتوں اور مٹی کے ڈھیروں کا جائزہ لیا۔ وہ ان سب کو صاف کرنے ہی آیا تھا۔

اس نے ٹوکری اور جھاڑو جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھی نیچے پٹک دی اور کام کرنے کے لیے اپنا لنگر لنگوٹ کسنے لگا۔ وہ پیپل کے درخت کے سایے میں کھڑا تھا جو مندر کے احاطے میں پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ اس پیپل کے درخت کے تنے کے گرد ایک چھوٹے سے پتھر پر

ایک خوب صورت سے بیتل کے پنجرے میں جو مندر کی طرح بنا ہوا تھا ایک سانپ کی پالش کی ہوئی تصویر تھی۔ اس کی توجہ اس طرف کھنچ گئی۔ "یہ سانپ کی تصویر کیسی تھی" اس نے اپنے آپ سے یونہی پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟ شاید کوئی سانپ درخت کی جڑوں میں رہتا ہے" اس کے ذہن نے خود ہی جواب دیا اور وہ کچھ ڈر بھی گیا اور غیر ارادی طور پر اس جگہ سے دور ہٹ گیا۔ پھر اس نے لوگوں کی لگاتار قطاریں مندر کے صحن میں آتی دیکھیں جو پہلے پیپل کے نیچے رکھے ہوئے اسی چھوٹے سے مندر کے اندر رکھے ہوئے ناگ دیوتا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کر رہی تھیں۔ اب اس کے حواس کچھ ٹھیک ہوئے۔ وہ اس جگہ پر گیا جہاں اس نے جھاڑو اور ٹوکری رکھ دی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے آنے کی تنبیہ کی آواز بھی لگاتار ہا مبادا اس کی لاپرواہی سے صبح والا واقعہ پھر دہرایا جائے۔ یہ بھیڑ بڑی قدامت پسند تھی جو چوڑی چوڑی سیڑھیوں پر سے اوپر نیچے اتر رہی تھی۔ کھلے دروازے میں سے اندر آرہی تھی اور باہر نکل رہی تھی۔ یہ بھاری بھیڑ جو اپنے نیلے، سفید، ہرے اور سوتی اور ریشمی کپڑوں میں تھی ایک دوسرے کو ہٹاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ باکھا نے بھیڑ سے پرے اندرونی آنکھ سے جھانکا کیونکہ وہ اِس راز کو جاننے اور اس کا حل پانے کے لیے ایک عام آدمی کی طرح نظریں اور چہرہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا، اس پھاٹک سے پرے جہاں دوسرے لوگ جا سکتے تھے۔ وہ تو اس غلام کی طرح جو اپنے آقا کے معاملات کو جاننا چاہتا ہے نظریں چرا کر ہی دیکھ سکتا تھا۔ "یہ لوگ یہاں کس چیز کی پوجا کرتے ہیں؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"رام رام، سری سری، نارائن، سری کرشنا" ایک بھگت نے اچھوت کے پاس سے گزرتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔ "ہے ہنومان جودھا کالی مائی" اب باکھا کو جواب مل گیا۔ 'رام' کا لفظ تو اس نے بارہا سنا تھا۔ 'سری سری' بھی اور اس نے ایک سرخ رنگ کا مندر بھی دیکھا تھا جس کی دیوار پر ایک بندر بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف پیتل کی سلاخوں کا پنجرہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ہنومان کی مورتی تھی اور اس نے ایک سرخ رنگ کا مندر بھی دیکھا تھا جس میں ایک سیاہی کی طرح کالی عورت کی مورتی تھی جس کی سرخ شعلہ بار زبان باہر لٹکی ہوئی تھی، جس کے دس ہاتھ تھے اور جس کے گلے میں کھوپڑیوں کا ایک ہار لٹکا ہوا تھا۔ کرشنا نیلے رنگ کا دیوتا تھا جو بازار میں پان والے کی دکان پر لٹکی ہوئی رنگین تصویروں

میں بنسری بجا رہا تھا۔ لیکن ہری کون تھا اور نارائن ؟ وہ بری طرح چکرا گیا جب ایک آدمی "اوم شانتی دیوا" کہتا ہوا گزرا۔ کیا وہ مندر میں تو نہیں آ گیا تھا ؟۔

"یہاں کھڑے ہو کر تو" اس نے سوچا "میرے لیے کسی بات کو دیکھنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں" لیکن اس میں جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے ایک کمزوری کا احساس کیا کیونکہ اچھوت اگر مندر میں چلا گیا تو مندر اتنا بھرشٹ ہو جائے گا کہ پھر ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔ اس کے باپ کو اگر پتہ لگ گیا کہ اس نے آج صبح کوئی کام نہیں کیا تو وہ سخت ناراض ہو جائے گا۔ کوئی آدمی اس کو یہاں بے مقصد گھومتا دیکھ لے گا تو وہ سوچے گا وہ چور تھا۔

لیکن وہاں کھڑے کھڑے اس کا جذبۂ تجسّس تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ اچانک اس نے اپنے دماغ سے یہ خیالات نکال دئے اور مضبوط ارادے سے جلد جلد سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ذہن پر ایک بوجھ، ایک تناؤ تھا اور وہ اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ مگر اب اس میں ڈر نہیں تھا۔ ایک قاتل جو مارنے کے فن میں طاق ہو، شاید اسی طرح سے آگے بڑھتا۔ لیکن جلد ہی اس کی چال میں وہ شان نہیں رہی کیونکہ وہ جھک کر چلنے لگا۔ مگر وہ برسوں سے اس طرح جھک کر چلنے کا عادی تھا۔ وہ بالکل اسی طرح سنا یا ہوا، عجز کا پتلا، نچلی ذات کا آدمی بن گیا جو وہ پیدائش سے تھا، ہر چیز سے سہما ہوا، آہستہ آہستہ دبی دبی نگاہوں سے جھک جھک کر بڑھتا ہوا۔ جب وہ پہلی دو سیڑھیاں چڑھ گیا تو ڈر کے مارے وہ بالکل پست ہمت ہو کر وہیں کھڑا ہو گیا اور پھر اسی جگہ پر لوٹ آیا جہاں سے وہ چلا تھا۔ اس نے اپنی جھاڑو کو لکڑی کے دستے سے پکڑ کر اٹھایا اور جھاڑو دینے لگا۔ اس کے سامنے مٹی کے ذرّے ایک چھوٹے سے بادل کی شکل میں اڑنے لگے۔ یہ ذرّے مٹیالے رنگ کے تھے اور جہاں جہاں سورج کی شعاعیں انھیں چھو رہی تھیں وہاں وہاں سنہری روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لیکن باکھا نے یہ بات نہیں دیکھی۔ اس کے لیے تو پیپل کے پتوں، گری ہوئی پھولوں کی پتیاں، کبوتروں کی بیٹ، انار کی سوکھی ٹہنیاں اور مٹی کو بہارنا زیادہ ضروری کام تھا۔ اور اس کا بھی اسے زیادہ احساس نہیں تھا حتیٰ کہ گرد و غبار اڑ کر اس کے نتھنوں میں گھسنے لگا اور اس نے اپنی ناک کے آر پار پگڑی کا سرا باندھ لیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم، گھوم کر کام کرنے لگا، اس بے ڈھنگی

کے ساتھ جو اس کے ساتھ مخصوص تھی۔ ٹٹیوں کے کام کے مقابلے میں یہ کام وقت لیتا تھا لیکن اگرچہ یہ کام زیادہ سستی کا اور اکتا دینے والا تھا مگر اس میں اتنا گندا پن نہیں تھا۔

اس نے کوڑا چھوٹے ڈھیروں میں اکٹھا کرلیا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ سارا کوڑا تو اپنی چھوٹی سی جھاڑو سے صحن کے چاروں طرف گھما کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کا ارادہ بعد میں ایک ایک کر کے ان ڈھیروں کو اپنی ٹوکری میں اٹھا کر پھینکنے کا تھا۔ جب ڈھیروں میں سارا کوڑا اکٹھا ہوگیا تو اس نے ایک منٹ کے لیے کھڑے ہوکر اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھا۔ مندر کی عمارت اس کے سامنے للکارتی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ نیچے جھک کر ان ڈھیروں کو اٹھانے لگا جو اس نے اپنی جھاڑو سے اکٹھے کیے تھے۔ اس کی اندرونی خواہش نے پھر زور مارا اور اس نے پھر اپنے آپ کو مندر کے اندر جاتی ہوئی سیڑھیوں پر کھڑے پایا۔ لیکن اب وہ خوف زدہ تھا۔ مندر تو اس کی طرف کسی دیو کی طرح بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا تاکہ اسے نگل جائے۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے جھجکا۔ پھر اس کی قوتِ ارادی واپس آگئی۔ وہ اچانک جوش سے چڑھا اور مندر کے دروازے تک پہنچتی ہوئی پندرہ سیڑھیوں میں سے پانچ پر چڑھ گیا۔ پھر وہ رک گیا۔ اس کے سینے میں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی خواہش نے اسے پھر اکسایا اور وہ ایک دو سیڑھیاں اور چڑھ گیا۔ یہاں پہنچ کر اچانک اس کا گھٹنا کسی چیز سے ٹکرا گیا اور اس کا توازن بگڑتے بگڑتے بچا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا اور ڈر تھا کہ گر نہ پڑے مگر اس نے نیچے سیڑھی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر اس نے اپنا توازن حاصل کرلیا اور ایک ہی سانس میں سب سے اوپر کی سیڑھی پر پہنچ گیا۔ یہاں سے، جس طور پر وہ پڑا ہوا تھا، وہ سنگِ مرمر کی دہلیز کے اوپر سے ذرا سا سر اٹھا کر اندر جھانک سکتا تھا۔ یہ دہلیز خوش قسمتی سے بھگتوں کے سروں کی مسلسل رگڑ سے گھس کر کچھ نیچی ہوگئی تھی اور یہاں سے وہ مندر کے اندرونی حصے کی ایک جھلک، صرف ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ اندر کے مندر کا حصہ اس کا ایک بھید، ایک نا افشا ہونے والا راز رہا تھا۔ پیتل کے پھاٹک کے پرے لمبی، اندھیری مقدس عمارتوں کے اندرونی نہاں خانوں میں بڑے بڑے طویل اندرونی راستوں کو پار کرتے ہوئے باکھا کی نظر ایک ابھرے ہوئے چبوترے کی گہرائیوں کو ٹٹولنے لگی۔ وہاں سنہری کام کے ریشمی اور مخملی جھلملاتے

پردوں کے پس منظر میں پیتل کی مختلف مورتیاں رکھی ہوئی تھیں جوان کے قدموں میں رکھی ہوئی ایک طشتری میں رکھی ہوئی اگربتی اور دھوپ کے ہلکے دھوئیں میں دھندلی نظر آرہی تھیں۔ ایک ادھ ننگا پجاری بیٹھا ہوا تھا جس کے منڈے ہوئے چہرے پر بالوں کی چوٹی کا ایک گچھا تھا جو اپنی کئی گانٹھوں کی بنا پر اور بھی نمایاں ہوگیا تھا۔ اس کے سامنے ایک کھلی کتاب لکڑی کے ایک چھوٹے سے سٹینڈ پر رکھی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پیتل کے برتن، سنکھ اور دوسرا پوجا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک لمبا آدمی، جو خود بھی پجاری معلوم ہوتا تھا اور جس نے ایک چھوٹی سی دھوتی کے سوا اور کچھ نہیں پہنا ہوا تھا اٹھا اور سنکھ بجانے لگا۔ اس کے بال کالے تھے اور جسم پھولا ہوا تھا اور اس نے جنیؤ پہنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے شاندار بدن کے خطوط اور زاویے مزید نمایاں ہوگئے تھے۔ باکھا نے دیکھا، غور سے جھانکا اور اس کی نظریں جم گئیں۔ صبح کی پوجا شروع ہوگئی تھی۔ "اوم شانتی دیوا" کے زور زور سے گانے کے بعد بیٹھے ہوئے پجاری نے جس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گھنٹی ٹن ٹن کررہی تھی اپنی آواز کو جو گھنٹی کی آواز کے سامنے بھدی اور بے سری لگ رہی تھی سنکھ کی آواز کے ساتھ ملادیا۔ کچھ لمحے پہلے کا خاموش مندر ایک جیتی جاگتی محسوس کرنے والی حقیقت ہوگیا۔ پوجا کرنے والوں کی بھیڑ مندر کے اندرونی دالانوں اور لمبے راستوں میں سے ہوتی ہوئی اس چبوترے کی طرف بڑھتی جہاں مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور گنبد کے نیچے کھڑے ہوکر ایک آواز میں "آرتی، آرتی" گانے لگے۔ پہلے سنکھ کی آواز اونچی اور مسلسل تھی اور اب رُک رُک کر آنے والی، نرم اور صاف تھی جیسے کسی راگ میں بدل گئی ہو۔ مگر اس میں لوگوں کے دل پر اثر کرنے والی ایک پراسرار طاقت تھی، ایک ایسی طاقت جو انسان کے رونگٹے بھی کھڑی کرسکتی تھی خاص طور پر جب وہ آخر میں اختتام پر آتی ہے اور گلے پھاڑ کر گائے جانے والے فتح یاب نعرے میں مل جاتی ہے ـــ "شری رام چندر جی کی جے!"

باکھا کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس پر بھجن کے سُر اور لَے کا بھی بڑا اثر پڑا۔ بھجن کی پہلی لائن سے لے کر آخری پرشور اور طاقتور نعرے تک اس کا خون اس کی رگوں میں اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ غیرارادی طور پر اس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے اور انجانے دیوتا

کی پوجا میں اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

لیکن ایک اچانک شور نے اس کے دھیان میں خلل ڈال دیا۔ ”بھرشٹ ہو گیا، بھرشٹ ہو گیا، بھرشٹ ہو گیا!“ ایک شور ہوا میں ابھرا۔ اُس کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اس کی زبان اور گلا سوکھ گیا۔ وہ چلّانا چاہتا تھا، خوف سے چیخ مارنا چاہتا تھا لیکن اس نے بولنے کے لیے اپنا پورا منہ کھولا لیکن بے سود۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس نے چاہا کہ وہ اٹھ جائے لیکن اس کے اعضا میں نام کو بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ایسا ہو گیا جیسے مردہ ہو۔

پھر جس طرح اچانک اس کے جسم کی طاقت زائل ہو گئی تھی اسی طرح دفعتاً اس میں ایک ہمت کی لہر ابھر آئی۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کا پردہ اٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ گرتی ہوئی مونچھوں والا ایک چھوٹا سا آدمی جسے وہ جانتا تھا کہ مندر کا ایک پجاری ہے، کانپتا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا، گرتا پڑتا صحن میں دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں دبی دبی ایک ہی آواز تھی: ”بھرشٹ ہو گیا۔ بھرشٹ ہو گیا۔ بھرشٹ ہو گیا۔“

”مجھے دیکھ لیا گیا ہے۔ لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا۔“ یہ فیصلہ باکھا کے ذہن میں لپکا۔ مگر اُس نے چلّاتے ہوئے پجاری کے پیچھے ایک عورت کو بھی دیکھا۔ وہ حیرت میں جکڑا ہوا کھڑا تھا لیکن اسے ابھی تک ڈر تھا اور وہ ابھی تک سوچ رہا تھا کہ وہ تباہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی یہ تباہی کس شکل میں ہوگی۔

لیکن اِس کا اسے جلد ہی پتہ لگ گیا۔ مندر میں سے چیختی چلاتی ایک بھیڑ نکلی اور لائن بنا کر کھڑی ہو گئی جیسے کسی کھیل تماشے کے آخری منظر میں سب اداکار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس سے کچھ سیڑھیاں نیچے، پتلا دبلا، چھوٹے قد کا پجاری ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بہن سوہنی (وہ عورت جسے اس نے پجاری کے پیچھے آتے دیکھا تھا سوہنی ہی تھی) شرما کر احاطے میں ایک طرف کو کھڑی تھی۔

”میں بھرشٹ ہو گیا۔ میں بھرشٹ ہو گیا۔ میں بھرشٹ ہو گیا۔“ نیچے کھڑا ہوا برہمن چلایا۔ اس کے سامنے کھڑی ہوئی بھیڑ سمجھ گئی اور لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اس کے پیچھے چلائے،

کچھ ڈر کے مارے اور دوسرے غصّے میں مگر سب کے سب جوش سے پاگل ہو رہے تھے۔ بھیڑ میں سے ایک آدمی نے اپنا نعرہ لگایا۔

" او بھنگی سیڑھیوں سے نیچے اتر آ۔ اترتا ہے یا نہیں۔ تو نے ہماری ساری پوجا بھرشٹ کردی۔ تو نے ہمارا مندر بھرشٹ کر دیا۔ تجھے پوتر کرنے والی ساری رسموں کا خرچ اپنا نا ہوگا۔ اُتر جا، دُور ہو جا او کُتّے۔"

باکھا دوڑ کر نیچے اتر آیا اور پجاری کے پاس سے ہوتا ہوا اپنی بہن کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اِس وقت اس کے دل میں دو احساسات تھے، ایک تو اپنے لیے خوف کا اس جرم کے لیے جو اس نے ابھی کیا تھا اور دوسرا اپنی بہن کے لیے اندیشے کا، اس جرم کے لیے جو شاید اس نے کیا ہو کیونکہ وہ بھی گونگی بنی ہوئی کھڑی تھی۔

" ارے تم تو دُور سے بھرشٹ ہوئے ہو" باکھا نے پجاری کو چیختے ہوئے سُنا۔ " لیکن مجھے تو چھو کر بھرشٹ کر دیا گیا ہے"۔

" دور۔۔۔۔ دور!" پوجا کرنے والے لوگ اوپر کی سیڑھیوں سے چلا رہے تھے۔ " شاستروں کے مطابق تو مندر اس وقت بھی بھرشٹ ہو جاتا ہے جب کوئی نچلی ذات کا آدمی اس کے ۹۶ گز کی دوری تک بھی آ جائے اور یہ تو سیڑھیوں کے اوپر تک چڑھا ہوا تھا اور عین دروازے پر تھا۔ ہم تو تباہ ہو گئے۔ اب ہمیں اپنے آپ کو اور مندر کو پوتر کرنے کے لیے یگ کرنا پڑے گا"

" لیکن میں۔۔۔۔ میں" پتلا دبلا پنڈت پاگلوں کی طرح چلایا مگر اپنا فقرہ پورا نہیں کر سکا۔

سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی بھیڑ کو یقین ہو گیا کہ سب سے زیادہ پنڈت جی بھرشٹ ہوئے تھے اور لوگوں نے اس پجاری کے ساتھ ہمدردی کی کیونکہ انھوں نے بھنگی کے لڑکے کو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیسے بھرشٹ ہوا تھا۔ انھیں اس کہانی کا پتہ نہیں تھا جو احاطے کے دروازے پر سوہنی نے روتے ہوئے اور سسکیاں لیتے ہوئے باکھا کو سنائی۔

" وہ آدمی، وہ آدمی" وہ بولی " اُس آدمی کی، جب میں اس کے گھر کی ٹٹّی صاف کر رہی تھی، اس کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے میرے ساتھ بری بری باتیں کیں۔

اور جب میں چلائی تو وہ یہ زور زور سے بولتا ہوا باہر بھاگا کہ میں نے اُسے بھرشٹ کر دیا۔"

باکھا اپنی بہن کو اپنے پیچھے کھینچتا ہوا اِدھر اُدھر دوڑا اور اس نے بھیڑ میں پنڈت کو تلاش کیا۔ لیکن اُس بچاری کا اب کچھ پتہ نہیں تھا اور آگے بڑھتی ہوئی بھیڑ بھی باکھا کے مضبوط قدموں کو مندر کی طرف خوفناک طریقے سے بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھاگتی نظر آئی۔ باکھا آگے بڑھنے سے رک گیا۔ جب اس نے بھیڑ کو واپس بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس کی مٹھیاں بند تھیں۔ اس کی وحشی نظروں سے آگ برس رہی تھی اور وہ دانت پیس کر دل میں بولا۔ "میں تمھیں دکھا سکتا تھا کہ اس برہمن نے کیا کیا ہے۔"

اسے محسوس ہوا کہ وہ اِن سب کو جان سے مار سکتا تھا۔ انتہائی غصّے سے وہ وحشی، زرد رو اور دیوانہ سا نظر آ رہا تھا۔ اِس قسم کا ایک اور واقعہ جو اس نے سنا تھا چشم زدن میں اس کے ذہن میں ابھرا۔ ایک نوجوان گنوار نے اس کے دوست کی بہن کو چھیڑا تھا جب وہ ایندھن کی لکڑی اکٹھا کر کے کھیتوں میں سے آ رہی تھی۔ اُس کا بھائی اپنے ہاتھ میں کلہاڑی لے کر سیدھا کھیتوں میں پہنچا تھا اور اس نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ "کتنی بے عزتی کی بات ہے" اس نے سوچا "کہ وہ ایک نوجوان معصوم لڑکی پر حملہ کرے اور پھر یہ بدمعاش دیکھو کہ یہ آدمی یعنی پنڈت جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے اسے بھرشٹ کیا ہے۔ بدذات کہیں کا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس نے میری بہن کی عزت نہیں لوٹی۔" یہ خیال آتے ہی اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا کہ کہیں پنڈت نے ایسا نہ کر دیا ہو۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور سوہنی کے پاس جا کر اس نے زور سے اس سے پوچھا۔

"مجھے بتا، صاف صاف بتا دے کہ اس نے تیرے ساتھ کچھ کیا تو نہیں؟"

سوہنی رو رہی تھی۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔

باکھا کی کچھ تسلی ہو گئی۔ "لیکن نہیں۔ اُس نے کوشش تو کی۔ اُس نے اس سے گندی گندی باتیں تو ضرور کی ہوں گی۔ پتہ نہیں اس نے کیا کہا۔ بوڑھا کھوسٹ۔ میں اسے

جان سے مار سکتا ہوں۔ میں اسے ختم کر سکتا ہوں" وہ یہ سوچ سوچ کر بڑا پریشان ہو رہا تھا کہ دراصل ہوا کیا تھا اور پھر بھی وہ اپنی بہن سے دوبارہ پوچھنے میں ہچکچا رہا تھا کہ کہیں وہ پھر نہ رو پڑے۔ لیکن سوہنی کے بارے میں اپنے شک اور ممکن واقعے کو وہ برداشت نہیں کر سکا۔

"سوہنی سچ بتا" وہ غصے میں اپنی بہن کی طرف مڑ کر بولا۔ "وہ کتنا آگے بڑھا؟"

سوہنی نے سسکیاں لینی شروع کر دیں اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"بتا دے، مجھے بتا دے۔ میں اسے جان سے مار دوں گا اگر اس نے...." وہ چلایا۔

"اُس... اس نے، صرف مجھے چھیڑا" وہ آخر میں دب کر بولی "اور جب میں کام کرنے کے لیے جھکی تو اُس نے پیچھے سے آکر مجھے چھاتیوں سے پکڑ لیا"

"سور کا بچہ!" باکھا چلایا "میں ابھی جا کر اسے ہلاک کر دوں گا" اور وہ اندھا دھند احاطے کی طرف بھاگا۔

"نہیں نہیں واپس آجا، چل دونوں یہاں سے چلیں" سوہنی پیچھے سے بولی اور اس نے اُس کے اوور کوٹ کو زور سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ باکھا چند لمحوں تک مندر کی طرف گھور کر دیکھتا رہا۔ دروازوں کے باہر اب ایک آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم سے بھی حرارت جا رہی تھی اور وہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں دروازوں سے لے کر چوٹی تک بنے ہوئے بُتوں میں الجھ گئیں۔ وہ سب بہت بڑے، خوفناک اور ستانے والے سے نظر آرہے تھے۔ وہ پھر دب گیا۔ اور اس پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دیوتا اسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ وہ اِتنے اصلی نظر آرہے تھے اور ان سے زیادہ خوب صورت چیز اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ ان کے دس ہاتھ اور پانچ سر تھے اور اُن کی آنکھیں اپنے پپوٹوں سے نکلی پڑ رہی تھیں اور ساکت تھیں۔ اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں دھندلی سی تھیں۔ اس کی بند مٹھیاں کھل گئی تھیں اور اس کے ہاتھ اب نیچے گرے ہوئے تھے۔ اس نے کمزوری محسوس کی اور اسے کسی

سہارے کی ضرورت تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے قدموں کو سنبھالا اور سوہنی کے ساتھ باہر کے گیٹ کی طرف چل دیا۔

سوہنی کا اس کے ساتھ ساتھ چلنا اس کے اندر غم اور غصے کی لہر پیدا کر رہا تھا۔ وہ اتنی نازک نظر آ رہی تھی اور اتنی خوب صورت تھی۔ باکھا کو اپنی بہن کی خوب صورتی کا احساس تھا۔ وہ پتلی، ہلکے رنگ کی، نرم گرم، خوش مزاج لڑکی تھی اور اس کے زیورات، کانوں کی بالیاں، باہوں میں چوڑیاں، ایک عجیب ہی سماں باندھ دیتے تھے۔ وہ بڑی شرمیلی تھی اور خاموش رہتی۔ ایک عجیب نرمی اور روشنی اس کے اندر بھری ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کے ساتھ ظلم کرے، اس کا شوہر بھی نہیں، جس کے ساتھ اس کی شادی دھارمک رسموں کے ساتھ ہوئی ہو۔ اس نے سوہنی کی طرف دیکھا اور اس کے مستقبل کی ایک تصویر اس کے سامنے آ گئی۔ اس کا ایک شوہر تھا، وہ آدمی جو اس کو قابو میں کر چکا تھا اور اس پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ جس شوہر کا اس نے تصور کیا وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ اس اجنبی کا تصور کر سکتا تھا کہ وہ سوہنی کی بھرپور ابھری ہوئی چھاتیوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا اور سوہنی ذرا شرما کر رضامند ہو گئی تھی۔ اسے اُس آدمی کے سوہنی کو ہاتھ لگانے کے تصور سے نفرت ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا اپنا کچھ کھو جائے گا۔ اس کا کسی بات کا نقصان ہوگا، یہ سوچنے کی اس میں ہمت نہیں ہوئی۔ "میں اس کا بھائی ہوں"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، اپنے خیالات کو درست کرنے کے لیے جو غلط راستے پر جا رہے تھے۔ لیکن اس کے اپنے ننگے دل میں سوہنی کے لیے جو جذبات تھے، اور اس محبت میں جو شوہر کی ہی ہو سکتی تھی، کوئی خاص فرق اسے نظر نہیں آیا۔ اس نے یہ سارے خیالات اپنے ذہن سے نکال دئے۔

اس کے ذہن میں تو اس چھوٹے سے پجاری کی تصویر ابھر رہی تھی۔ اس کا خون ابلنے لگا۔ اس نے اپنے اندر بدلہ لینے کی زبردست خواہش کا احساس کیا۔ یہ بدلہ اس کے لیے پنڈت کو لاتوں اور مکّوں سے زدوکوب کرنے سے لے کر اس کو جان سے مارنے تک کا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ہزاروں سال کی خدمت گزاری اور بندھن نے اسے پست ہمت بنا دیا تھا لیکن آج اس کھلے آسمان کے نیچے جو وقتی جذبات اس کے دل میں بیدار ہو گئے تھے انھوں نے زندگی کے لیے اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیا تھا۔

وہ ایک دیہاتی خاندان کا تھا لیکن اس کے آباواجداد کے اپنا پیشہ بدلنے سے وہ سماجی میزان میں بہت نیچے جھک گئے تھے۔ اب اس کے بزرگوں کا دیہاتی خون جو انھوں نے اپنی زندگی جینے کے لیے، چاہے وہ کتنی بھی غلامانہ کیوں نہ ہو، خود اپنی رگوں میں سمویا تھا، اس میں بھی دوڑ رہا تھا۔ "مجھے اس کی خبر لینی چاہیئے تھی" وہ اپنے آپ سے بولا۔

جب کبھی باکھا کہیں جانے کا یا کچھ کرنے کا مصمّم ارادہ کرتا تو وہ انسانیت کا بہترین نمونہ بن جاتا اور اس کا عمدہ جسم گھاٹ پر کسی شیر کی طرح نمودار ہوتا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایک بے چارگی لکھی ہوئی ہوتی۔ وہ ان بندشوں کو پار نہیں کر سکتا تھا جو بڑی ذات کے لوگوں کی روایتوں نے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے لگا دی تھیں۔ وہ اس طلسمی دائرے پر حملہ نہیں کر سکتا تھا جو ایک بچاری کو کسی بھی آدمی کے حملے سے بچاتا ہے، خاص طور پر نچلی ذات کے آدمی کے حملے سے۔ اس لیے اس کی طاقت کے سب سے بڑے لمحوں میں، اس کے اندر کے غلام نے اپنا سر ابھارا اور وہ ظلم سہتا ہوا اپنے ہونٹوں سے اپنی شکایتوں کا رونا روتا ہوا دب گیا!

بھائی اور بہن کے سامنے مندر سے نکلنے کے بعد ایک مصروف بازار آگیا۔ باکھا نے اس پر دور تک ایک بے معنی سی نظر ڈالی۔ اس کے لامحدود تنوع نے اب اس کا دھیان نہیں کھینچا۔ اب اس میں کسی چیز کو دیکھنے یا سننے کا صبر نہیں تھا اور نہ وہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا۔ "میں نے جا کر اُس پگلے بھگت کو جان سے کیوں نہیں مار دیا؟" وہ آہستہ سے بولا "مجھے سوہنی کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینا چاہیئے تھا۔ ہر ایک آدمی کو اس بات کا پتہ لگ جائے گا۔ بے چاری میری بہن۔ اس کے بعد وہ دنیا کو اپنا چہرہ کیسے دکھا سکتی ہے۔ لیکن اس نے مجھے کیوں نہیں جانے دیا تاکہ میں اسے ختم کر دیتا؟ وہ ہمارے گھر میں لڑکی بن کر کیوں پیدا ہوئی؟ ہمارے گھر کے لیے یہ بدنامی کیوں لائی؟ وہ کتنی خوبصورت ہے! مگر اتنی خوبصورت ہونے پر کتنی بدبخت ہے! کاش وہ دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہوتی۔ پھر اسے کوئی بھی نہ چھیڑتا۔" لیکن وہ اس خیال کو کہ سوہنی بدصورت ہوتی برداشت نہ کر سکا۔ اسے اس کی خوبصورتی پر ناز تھا اور اس کے اس احساس کو چوٹ پہنچی۔ اس نے صرف یہ چاہا "او پرماتما تو نے اسے پیدا ہی

کیوں کیا؟" پھر اس نے سوہنی کو دیکھا جو جھک کر اپنے پلّو سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ اس کے اندر اچانک ایک ہمدردی اور رحم کا جذبہ ابھرا اور وہ اپنی بہن کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر اسے لے جانے لگا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے غصے اور غم کے خیالات موجزن تھے اور وہ سخت مایوسی اور ناامیدی سے کانپ سا رہا تھا۔

تھوڑا سا اور چل کر اس نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔ اب وہ آرام سے سانس لے رہا تھا۔ اس کا بڑا، کم گوشت کی ہڈیوں کا جسم اس کے بے پناہ جوش کی وجہ سے ایک خوشنما، چست بلکہ بھاری جسم میں بدل گیا۔ اس کے اندر سڑک پر پھرتے ہوئے لوگوں کے خوف نے جو بدتمیز اور گنوار آدمیوں کی اچھی اور بری سب باتیں جلدی سے بھانپ لیتے تھے، اسے اپنے بارے میں محتاط بنا دیا۔ اب وہ اپنے آج کے تجربے کو یہ کہہ کر برداشت کر رہا تھا کہ یہ تو صدیوں کی غلامی اور خدمت گزاری کا نتیجہ تھا اور یہ عاجزی تو انھیں اپنے بے شمار نچلی ذات کے بزرگوں سے وراثت میں ملی تھی اور ہر نئی نسل میں ذات پات کے اس بندھن کی وجہ سے اور زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

"سوہنی تو گھر جا" اس نے اپنی بہن سے کہا جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور شکست خوردہ اور شرمسار تھی، بدنامی کے اس دھبّے سے جو آج کے حادثے میں اس پر لگ گیا تھا۔ "ہاں تو اب گھر چلی جا" وہ بولا "میں جا کر روٹی لے آتا ہوں۔ یہ جھاڑو اور ٹوکری اپنے ساتھ لے جا۔" سوہنی نے بغیر اپنا سر اٹھائے ہاں کر دی پھر اس نے ٹوکری اور جھاڑو باکھا کے ہاتھ سے لے لی اور اپنے چہرے کے آگے چادر کا پلّو ڈال کر شہر کے پھاٹکوں کی طرف بڑھی۔

باکھا نے ایک نظر اپنی بہن پر ڈالی اور مندر سے پرے کی طرف آہستہ آہستہ چل دیا۔ وہ ایک ننگے پاؤں دکاندار سے جو کسی مقدس بیل کی طرح ایک دکان سے دوسری دکان پر دوڑتا ہوا جا رہا تھا، ٹکراتے ٹکراتے بچا اور اسے اچانک اپنی خبرداری کی پکار یاد آ گئی۔ "پوش، پوش، بھنگی آتا ہے۔" جب وہ ایک بے خودی میں لوہاروں کے بھیٹر بھڑ کے والے بازار میں سے گزرا جہاں لوگ طرح طرح کے الٹے سیدھے

لباس پہنے جو باکھا کی سمجھ کے مطابق نہ انگریزی تھے اور نہ ہندوستانی، دیوانہ وار آجا رہے تھے تو اس نے اپنے آپ کو ایک گلی کے باہر کھڑے ہوئے پایا۔ یہ گلی ایک جماہی کی طرح ایک پھل والے کی دکان اور ایک عطار کی دکان کے بیچ میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ خالی خالی سا محسوس کر رہا تھا اور اس خالی پن کے نیچے ایک گھبراہٹ تھی جو اس کے اندر پیدا ہونے والے جذبات میں تضاد کے گہرے اثر کی پیداوار تھی۔ لیکن ظاہرہ طور پر وہ خاموش اور بغیر کسی پریشانی کے تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے چپ چاپ کھڑا ہو گیا تاکہ وہ فیصلہ کر سکے کہ اسے کس سمت میں جانا ہے کیونکہ وہ ایک بے ہوشی کے سے عالم میں چلتا رہا تھا۔ "مجھے روٹی مانگنے اسی گلی کے گھروں میں جانا ہے" اس نے اپنے آپ سے کہا اور گلی میں مڑ گیا۔

ایک آوارہ کتا، کمزور، چیچڑیاں لگا ہوا اور بیمار رفعِ حاجت میں مشغول تھا۔ ایک اور کتا جس کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، نالی کو روکے ہوئے گندگی کے ڈھیر پر پڑی خراب خوراک کو چاٹ رہا تھا۔ آگے چل کر عین راستے کے بیچ میں ایک گائے لیٹی ہوئی تھی۔ باکھا نے گلی میں جگہ جگہ پڑی ہوئی گندگی کو لاپروائی سے دیکھا لیکن جانوروں پر اسے بڑا طیش آیا۔ وہ کتوں کے پاس پہنچا اور انھیں حیران کرنے کے لیے جوتوں سے پھٹ پھٹ کی آواز کر کے زور سے کودا اور کتے ایک چیخ مار کر اور دم دبا کر بھاگ گئے۔ لیکن گائے کی بے حسی کو جو آرام سے لیٹی ہوئی تھی توڑنا بڑا مشکل تھا۔ باکھا کے لیے خاص طور پر اس لیے مشکل تھا کہ اگر وہ گئو ماتا کو پریشان کرے گا تو وہ ہندو امیر مالک مکان جن کے مکانوں کے آگے وہ لیٹی ہوئی تھی خفا ہو جائیں گے۔ وہ اس کے سینگ پکڑ کر اپنی ٹانگوں کو اس کے مشہور غصے سے بچاتا ہوا آگے نکل گیا۔ یہاں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پکی اور بوسیدہ اینٹوں کے چبوتروں پر اور ان کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ اس سے باکھا کو اپنی بہن کی مزید لاپروائی کی یاد دہانی ہو گئی کہ آج صبح اس نے اس گلی میں اپنا کام ٹھیک طرح سے نہیں کیا۔ لیکن اس کی مصیبت کا خیال کرتے ہوئے اس نے اسے معاف کر دیا۔ کوئی بھی عورت جس کی اس طرح سے بے عزتی ہوئی ہو جیسے سوہنی کی ہوئی تھی ٹھیک طرح کام نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یہ تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ سوہنی کا جو بچاؤ وہ کر رہا تھا وہ نامناسب تھا کیونکہ مندر کے گھر کو صاف کرنے

کے لیے جانے سے پہلے اُس کو اِس گلی کے گھروں کا کام کرنا تھا۔ یہاں ٹھٹھیرے تانبے کے برتن بنانے میں مصروف تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی اندھیری دکانوں میں بیٹھے ہوئے تانبے پر ہتھوڑے پر ہتھوڑا چلا رہے تھے۔ باکھا کی توجہ ان دکانوں نے کھینچی اور کچھ دیر تک وہ آرام سے چلتا رہا۔ یہ شور اسے خوشگوار لگا اور کچھ فاصلے سے تو یہ مسرت بخش بھی لگا۔ اِس کی وجہ سے وہ کام کے بارے میں اپنی بہن کی کوتاہی کو بھی بھول گیا۔ لیکن ذرا اور آگے بڑھ کر ان دکانوں سے نکلتی ہوئی "ٹھک ٹھک" "ٹھک ٹھک" ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہ جلدی سے اُس چھوٹی سی گلی میں گھس جاتا جہاں گھروں میں اسے روٹی کے لیے آواز لگانی تھی مگر اس نے دیکھا کہ ایک پوجا پاٹھ والا ہندو گلی کے بیچ میں بنے کنویں کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اپنے جسم پر صرف لنگوٹی پہنے ہوئے ننگے بدن نہا رہا تھا اور باکھا رک گیا کیونکہ اس آدمی کے تیل لگے ہوئے مقدس جسم سے بارش کی طرح چاروں طرف گرتے ہوئے پانی سے اس کا اچھی طرح سے بھیگنا ناگزیر تھا۔ باکھا نے انتظار کیا حتیٰ کہ اس پاکباز ہندو نے ایک پورا ڈول اپنے سر پر خالی کر لیا اور خالی ڈول کو دوبارہ کنویں میں پھینک دیا۔ پھر وہ اس تنگ، اندھیری اور گیلی گلی میں گھس گیا جہاں آمنے سامنے سے آتے ہوئے دو موٹے آدمی مشکل سے گزر سکتے تھے۔ یہ گلی ٹھنڈی تھی اور اس نے یہاں زیادہ سکون محسوس کیا کیونکہ اس جگہ ٹھٹھیروں کے ہتھوڑوں کا شور بڑا دھیما تھا۔ لیکن اس کی ہمت اور جوش و خروش کی آزمائش تو ابھی ہونی تھی کیونکہ وہ بھنگی ہونے کی وجہ سے سیڑھیوں کے اوپر چڑھ کر اوپر کی منزل میں جہاں رسوئی ہوتی تھی روٹی کے لیے آواز لگا کر گھروں کی پاکیزگی کو بھنگ نہیں کر سکتا تھا بلکہ اسے تو نیچے ہی سے چلّا کر اپنے آنے کی اطلاع دینی تھی۔

"ماں جی بھنگی کی روٹی، بھنگی کی روٹی دے دو۔" وہ پہلے گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر چلّایا۔ لیکن اس کی آواز ٹھٹھیروں کی 'ٹھک ٹھک'، 'ٹھک ٹھک' میں جو گلی تک پہنچ رہی تھی ڈوب گئی۔

"ماں جی بھنگی روٹی کے لیے آیا ہے۔ بھنگی روٹی کے لیے آیا ہے۔" وہ اور زور سے چلّایا۔

لیکن سب بے سود رہا۔
وہ گلی کے اور اندر گھس گیا اور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر جہاں چار گھروں کے دروازے ایک دوسرے کے پاس تھے اس نے چلا کر اپنی آواز لگائی۔
"ماں جی بھنگی کے لیے روٹی، بھنگی کے لیے روٹی دے دو۔"
لیکن گھروں کی اوپر کی منزل میں کوئی بھی اِس پکار کو سنتا ہوا معلوم نہیں دیا۔ اس نے چاہا کہ کاش یہ سہ پہر کا وقت ہوتا جب گھروں کی عورتیں اوپر سے نیچے اتر آتی ہیں اور گھروں کے بڑے کمروں میں بیٹھ جاتی ہیں یا گلی میں موریوں پر بیٹھ کر گپ شپ مارتی ہیں یا چرخہ کاتتی ہیں۔ لیکن اس کے سامنے کسی کی موت پر عورتوں کا گلی میں پھسکڑا مار کر بیٹھنے اور ایک دوسرے کی چادروں میں منہ چھپا کر رونے یا چھاتیاں پیٹ کر سوگ منانے کا منظر آ گیا اور وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔
"ماں جی بھنگی کی روٹی" وہ پھر چلایا۔
اِس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی ٹانگیں درد کرنے لگیں۔ اس نے اپنے جسم میں ایک سستی، ایک عجیب سی بے چینی کا احساس کیا۔ اس کے ذہن نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ تھک ہار کر وہ گلی کے ایک گھر کے لکڑی کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ وہ اتنا تھک گیا تھا کہ تنگ سا آ گیا تھا۔ دراصل تنگ آنے کے مقابلے میں وہ تھک زیادہ گیا تھا۔ اپنے صبح کے تجربے کو تو وہ اب بھول سا گیا تھا۔ اس کی ہڈیاں ایک طرح سے سوسی رہی تھیں۔ اس نے اس کے خلاف جدوجہد کی اور وہ اپنی آنکھوں کو کھلی رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے کمرے کے دروازے کی سخت لکڑی کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا تاکہ اپنے تھکے ہوئے اعضا کو کچھ آرام دے سکے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی جگہ تو نالی کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے چھوٹے سے لکڑی کے تختے سے پرے ہے اور اس کو وہیں کھڑا ہونا چاہیئے جہاں سارے گھر کی گندگی پائپ سے گر کر بہتی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ اپنی ٹانگیں سکیڑ کر وہیں چبوترے پر ایک کونے میں نیچے بیٹھ گیا اور اس پر پھیلے ہوئے اندھیرے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ جلد ہی نیند کی آغوش میں پھسل گیا۔
بد قسمتی سے اس کے تھکاوٹ سے چور بدن کے لیے یہ بے ساختہ آئی نیند

بے آرامی کی آدھی نیند تھی۔ اس کے ذہن کی گہرائیوں اور نہاں خانوں سے ابھر کر اسے
بہت سے عجیب وغریب سپنے آنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے انوکھے
سے شہر میں بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک بیل گاڑی میں سوار جا رہا تھا۔ اس کا سامنا ایک شادی
کے جلوس سے ہوا جس میں لوگ عمدہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہنستے ہنستے جا رہے تھے۔ اس
سے پہلے ایک پالکی گئی تھی جس پر سرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے اور اسے چار
آدمی اٹھائے ہوئے تھے اور اس سے بھی پہلے یعنی سب سے آگے ایک سکھ بینڈ تھا
جس نے انگریزی فوج کی سی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ باجے والے نفیری، بگل، بنسریاں
اور پیتل کے بڑے ہوئے منہ سے بجانے والے بڑے بڑے ساز اور ڈھول لیے
ہوئے تھے۔ وہ ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں چل رہے تھے۔ مگر یہ باجے والے وہ
دھنیں نہیں بجا رہے تھے جو اس نے چھاؤنی میں سن رکھی تھیں بلکہ ان کے نغمے بے سُرے
چیخ و پکار سے بھی زیادہ تیز، عجیب وغریب اور خلل ڈالنے والے تھے۔ اس کے بعد
اس نے اپنے آپ کو ریل کے پلیٹ فارم پر پایا۔ اس کے سامنے چالیس لوہے کے بند
ڈبوں پر مشتمل ایک مال گاڑی کھڑی تھی جس کے دونوں طرف انجن لگا ہوا تھا۔ کسی جگہ
ایک لمبی قطار میں اسے کھلے ہوئے ٹرک بھی نظر آئے جن پر پتھر، شہتیر اور عمارتی
لکڑی کے ذخیرے تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہ ان میں سے ایک ٹرک پر سامان کے اوپر
چڑھ کر بیٹھ گیا۔ لکڑی کا ایک گٹھا اس کے ایک طرف تھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں
پکڑے ہوئے کام والی چاندی کے دستے کی چھڑی لے رکھی تھی۔ سولا ٹوپی اس کے سر پر
تھی اور اس کے باپ کی حقے کی نے اس کے منہ میں تھی۔"

اچانک اس مال گاڑی کے ڈبے چلنے شروع ہو گئے۔ اسے فوراً ہی چوں چوں،
چیخوں اور پھر آہ و بکا، رونے دھونے اور شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں جیسے پاس
کے مگر یہاں سے نہ نظر والے ریل کے شیڈ میں کوئی قتل ہو گیا ہو۔ خوف اور بے بسی
کے مارے اس نے خود کو ڈبے کے سرے پر جھکا ہوا پایا۔ اسے پتہ لگا کہ یہ شور تو ان
نیلی وردی والے قلیوں کا تھا جو شیڈ میں کسی ڈبے کو دھکیل رہے تھے۔ اس کے بعد
اس نے اپنے آپ کو ایک گاؤں میں پایا جس کی گلیاں بڑی تنگ تھیں اور جس کے دونوں
طرف پانی کی چھوٹی چھوٹی سی نالیاں بہہ کر گلیوں کو کیچڑ اور گندگی سے پُر بنا رہی تھیں۔

اسے دو گائیں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی نظر آئیں اور دو بڑی مال گاڑیاں جن پر خوب مال لدا ہوا تھا دوسری سمت سے آتے ہی کیچڑ میں دھنس گئیں۔ کھلی دکانوں پر پڑے اناج کے ڈھیر پر کچھ چڑیاں اتر گئیں اور اپنا پیٹ بھرنے لگیں۔ ایک کائیں کائیں کرتا ہوا کوا نیچے اتر کر ایک بیل کی چھلی ہوئی گردن پر بیٹھ گیا اور ٹھونگیں مارنے لگا۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو مٹھائی کی دکان کے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ وہ بچی مسکراتی ہوئی اپنی خریدی ہوئی مٹھائی کو ہاتھ میں اوپر اٹھائے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ایک کوے نے نیچے اتر کر اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور اس کی مٹھائی کو نالی کے پاس پڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ وہ رونے لگی۔ ایک چاندی کے کام کے سنار نے جو خوبصورت اور لمبا چوڑا تھا اور ایک کچے کوئلے کی آگ کے سامنے بیٹھا ہوا زیورات گھڑ رہا تھا، سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر اس نے اپنی چمٹی سے ایک جلتا ہوا کوئلہ اٹھا کر اس لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بچی خوشی خوشی ایک چھوٹے سے تنگ راستے میں سے آگے بڑھی کیونکہ وہ اپنے ہاتھ میں یہ چھوٹی سی آنچ ماں کا چولہا جلانے کے لیے لے جا رہی تھی۔ اس کے بعد باکھا نے اپنے آپ کو ایک اسکول کے احاطے میں دیکھا جہاں لڑکے بسنتی رنگ کی پگڑیاں پہنے زور زور سے پڑھ رہے تھے اور ان کا ماسٹر ہاتھ میں ایک چھڑی لیے ہوئے بیٹھا تھا اور ان پر نگرانی کی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جماعت کا مانیٹر باری باری بینچوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں کو نظم کا ایک شعر دے رہا تھا جو وہ اس کے پیچھے دہرا رہے تھے۔ اس عجیب و غریب شہر میں سڑکوں اور گلیوں کے ایک جال کے پیچھے ایک ندی بہہ رہی تھی جس کے کنارے پر ایک محل بنا ہوا تھا۔ اس کی گنبد دار اندرونی چھت کو پتھر کے ستونوں نے تھاما ہوا تھا اور جس کے پتھر کی کھدائی کے کام کی فراوانی توجہ کھینچتی تھی۔ باکھا نے اس کی طرف حیرت اور تعریف کے احساس میں دیکھا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس میں داخل ہو گیا اور اس نے دیکھا کہ کیسے ایک پوری چٹان کو کاٹ کر اسے تراشا گیا تھا۔ اس کی چھت پر سرخ، سنہری، کالا اور ہرا روغن کیا ہوا تھا۔ چاروں طرف مزین ستونوں اور محرابوں سے گھری ہوئی آخر میں ایک کھلی جگہ پر ایک چھوٹے سے چبوترے پر ایک دبلے پتلے نہایت کمزور آدمی کو کچھ لوگ لیے ہوئے کھڑے تھے۔ گنبد میں سے چند سپاہی بات کرتے ہوئے خوش خوش، کچھ کچھ آوازیں نکالتے ہوئے مسکراتے ہوئے نکلے اور اس آدمی کو ایک بڑے

میدان میں شمشان گھاٹ میں سے گئے جہاں کل شام کے مُردوں کی چتاؤں میں ابھی تک آگ تھی اور انسانی جسموں کے ڈھیروں میں سے تھوڑا تھوڑا چکر کھاتا ہوا دھواں نکل رہا تھا۔کئی پنڈت مردہ جسموں کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور مُردوں کی راکھ کو اپنے بالوں میں ڈال رہے تھے، کوئی نشیلی چیز پی رہے تھے اور ایسا رقص کر رہے تھے جیسے ہر شئے کو تباہ کر دیں گے۔ ایک کونے میں سے ایک گورا صاحب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس منظر پر مسکرا رہا تھا۔ باکھا نے دیکھا کہ اِن مقدّس آدمیوں میں سے ایک نے جو ایک سنیاسی معلوم ہوتا تھا اور جس کی عمر دس ہزار سال بتائی جاتی تھی جو مُنڈے ہوئے سر سے ننگا، خاموشی سے عبادت میں بیٹھا ہوا تھا، کوئی جادو کیا جس سے صاحب ایک چھوٹے سے کالے کتے میں بدل گیا۔ باکھا نے اسے کوئی تحفہ دینے کے بارے میں سوچا لیکن اس سنیاسی کے چیلوں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ باکھا کھڑا ہوا حیرانی سے سوچ رہا تھا کہ سنیاسی کیسے رہتا ہے۔ پھر ایک درخت سے بندروں کا ایک جھنڈ کودا اور ـــــ اس کے کانوں میں "الکھ الکھ" کی آواز پڑی۔ اس آواز سے وہ جاگ گیا۔ اس چمک میں جو بیڑھیوں پرسے دھوپ اس کے چہرے پر ڈال رہی تھی اس کا خواب بالکل ختم ہو گیا۔ باکھا کو پتہ تھا کہ دوپہر ہو گئی تھی اور یہ وہ وقت تھا جب سارے فقیر اور سادھو اور پنڈت خیرات لینے کے لیے دھارمک لوگوں کے دروازوں پر آواز لگاتے تھے اور یہ خیرات وہ اپنا حق سمجھتے تھے صرف اِس لیے کہ وہ ایشور کے بھگت تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک دم سمٹایا اور آنکھیں مل کر سوچنے لگا۔ "مجھے اب جلدی روٹی مل جائے گی۔" وہ جانتا تھا کہ اس وقت گھروں کی عورتیں بھبوت لگائے بیٹھی ہوئی سادھو سنیاسیوں کی انتظار کر رہی ہوں گی کیونکہ وہ سادھو سنتوں کی آؤ بھگت کیے بغیر بھوجن نہیں کرتی تھیں۔ "مجھے اب جلدی روٹی مل جائے گی۔" اس نے پھر سوچا اور اس نے بغیر اٹھے ہوئے ایک سادھو کی طرف دیکھا۔ وہ سادھو اسے گھور کر دیکھنے لگا باکھا پر پھر چند لمحوں پہلے والی غنودگی سی طاری ہو گئی۔

"بم بم۔ بھولے ناتھ"، سادھو اپنی مخصوص بولی میں چلایا اور اپنے بازوؤں میں پہنے ہوئے کڑوں کو کھڑکھڑانے لگا۔ اِس آواز کے سنتے ہی دو عورتیں بھاگی بھاگی اپنے گھروں کی چھتوں پر گئیں۔

"میں بھوجن لا رہی ہوں سادھو جی۔" وہ عورت جس کے دروازے پر باکھا آرام کر رہا تھا چلائی۔ لیکن اپنے گھر کے سامنے لکڑی کے چبوترے پر بھنگی کے گٹھڑی بنے جسم کو دیکھ کر وہ وہیں رک گئی۔

"او اپنے مالکوں کو کھانے والے" وہ چلائی "تیرا بیڑا غرق ہو وے، تجھے موت آجائے۔ تو نے میرا گھر بھرشٹ کر دیا۔ اٹھ اور دفع ہو جا۔ اپنے مالکوں کو کھانے والے، تجھے روٹی چاہیئے تھی تو تو نے آواز کیوں نہیں لگائی؟ یہ کیا تیرے باپ کا گھر ہے کہ آکر مزے سے لیٹ گیا؟"

باکھا یہ دیکھ کر کہ سادھو کے لیے اس عورت کی نرم اور مہربان آواز ایک قہر کی آواز میں بدل گئی تھی کیونکہ وہ بھنگی تھا، وہ فوراً اٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور اپنی سستی کو جو گرم ہوا کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی، جھاڑتا ہوا اس سے معافی مانگنے لگا۔

"ماں جی مجھے معاف کر دو۔ میں نے روٹی کے لیے زور سے آواز دی تھی لیکن تم شاید کام میں لگی ہوئی تھیں اور تم نے میری آواز نہیں سنی۔ میں تھکا ہوا تھا اس لیے نیچے بیٹھ گیا تھا۔"

"لیکن موئے مالکوں کو کچا کھانے والے، تجھے اگر بیٹھنا ہی تھا تو میرے دروازے کے باہر کیوں نہیں بیٹھا؟ تو نے تو میرا دھرم بھرشٹ کر دیا۔ تجھے چاہیئے تھا کہ گلی میں بیٹھتا۔ اب مجھے سارے گھر میں گنگا جل چھڑکنا پڑے گا۔ نمک حرام کہیں کا۔ کتنا غضب کر دیا تو نے۔ آج کل تم بھنگیوں نے تو اپنا سر آسمان تک اٹھا لیا ہے۔ میری قسمت بھی کتنی خراب ہوئی اور وہ بھی منگل کے دن اور میرے مندر ہو آنے کے بعد۔" اس نے سادھو کو دیکھا اور اپنی زبان کی گالیوں اور برا بھلا کہنے کی رفتار کو روک لیا۔ باکھا نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

"سادھو جی ذرا دھیرج رکھنا،" اس کی آواز پھر آئی، "میں ابھی جا کر آپ کا بھوجن لے آتی ہوں۔ اِس مالکوں کو کھانے والے نے مجھے یہاں روک کر میری روٹی بھی جلوا دی ہوگی۔" وہ چھت پر اس جگہ سے ہٹ کر پیچھے چلی گئی۔

اس اثنا میں وہ دوسری عورت جو جتنی موٹی تھی اتنی ہی چپ چاپ تھی، ایک ہاتھ میں چاول اور دوسرے میں روٹی لیے نیچے اتر آئی۔ چاول تو اس نے سادھو کے جھولے میں ڈال دئے اور روٹی اس نے باکھا کو دے دی اور بڑی نرمی سے بولی۔

" کاکا تجھے لوگوں کے دروازے کے سامنے اِس طرح نہیں بیٹھنا چاہیئے۔"

" پھولو، پھلو، لمبی آیو پاؤ" سادھو نے خیرات پاتے ہی کہا " کیا تم سادھو کو تھوڑی سی دال نہیں دے سکوگی؟"

" ہاں سادھو جی" وہ بولی " کل، کل سے تمھیں دال بھی دیا کروں گی۔ میں ابھی کھانا بنانے میں لگی ہوئی ہوں۔" اور وہ یہ کہتی ہوئی کہ اسے کھانا بنانا ہے اوپر چڑھ گئی۔

ناپاک ہوئے مکان کی مالکن اب نیچے آگئی۔ جتنی وہ جُسم میں چھوٹی تھی اتنی ہی زور زور سے بول رہی تھی۔ اس نے عقاب کی سی آنکھوں سے باکھا کی طرف دیکھا اور اسے جھڑکتے ہوئے بولی۔" واہ تو نے تو آج خوب کام کیا۔ میرے گھر کو ہی بھرشٹ کر دیا۔" پھر وہ سادھو کی طرف مڑی اور اس کے بھکشا کے لیے کالی ہڈی کے کشکول میں گرم گرم بھاپ اڑتی ہوئی رسے دار سبزی اور پکے ہوئے چاول کا ایک کٹورہ الٹ دیا۔" سادھو مہاراج اسے قبول کرلو۔ گھر تو سارا ٹھیک ہے۔ سچ پوچھو تو اس نے بھرشٹ نہیں کیا۔ ہاں سادھو جی کیا تم کوئی دوا میرے بیٹے کے بخار کو ٹھیک کرنے کی دے سکتے ہو؟"

" پرماتما تمہارا اور تمہارے بچوں کا کلیان کریں" سادھو بولا " میں کل تمہارے لیے کچھ جڑی بوٹیاں لے آؤں گا۔" اور سادھو بھکشا لے کر جو وہ اپنے بھگتوں کی دیکھ بھال کرنے کے عوض اپنا حق سمجھتا تھا، پیٹھ موڑ کر چل دیا۔

" پرماتما کرے تجھے موت آجائے" اس عورت نے باکھا کو بددعا دی۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ سادھو مہاراج کی سیوا کر کے اس نے کافی پن کما لیا تھا اور اُسے اس پن کو بھنگی کو ستا کر کم نہیں کرنا چاہیئے۔" آج تو نے یا تیری بہن نے کیا کام کیا ہے جو تجھے کوئی روٹی دے گا؟ آج وہ صبح گلی میں جھاڑو لگانے ہی نہیں آئی اور تو آیا تو تُو نے

میرا گھر بھرشٹ کر دیا۔ آ تھوڑی سی موری صاف کر دے، پھر تجھے روٹی دیدوں گی۔ میرا گھر بھرشٹ کیا ہے تو تھوڑا سا کام بھی کر دے۔"

باکھا نے کچھ دیر تک اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی گالیوں سے ڈر کر اس نے چھوٹی سی جھاڑو لکڑی کے چبوترے سے نکال کر جہاں وہ بیٹھا تھا گندی نالی کو صاف کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن جھاڑو کو اسی جگہ چھپا کر رکھ دیتی تھی۔

"اماں" ایک چھوٹا سا بچہ اوپر سے بولا "مجھے ٹٹی آرہی ہے۔"

"ابھی مت کریو" ماں بولی جو باکھا کے کام پر نگرانی رکھ رہی تھی "اوپر ٹٹی ہیں جائے گا تو سارے دن پاخانہ بھنکتا رہے گا۔ جلدی سے نیچے سیڑھیوں سے اتر آ اور یہاں موری میں بیٹھ جا۔ بھنگی اسے ایک دم صاف کر دے گا۔"

"نہیں" ضدی بچے نے ناکردی کیونکہ اسے نیچے کھلی نالی میں بیٹھنے میں شرم آتی تھی۔

اس کی ماں دوڑ کر اسے لانے کے لیے اوپر پہنچی۔ وہ باکھا کو روٹی دینا بھول گئی تھی۔ اپنے گھر کے اوپر پہنچ کر اس نے اپنے بیٹے کو بغیر روٹی کے بھیج دیا۔ چونکہ وہ اب دوبارہ نیچے کا چکر لگانا نہیں چاہتی تھی اس نے باکھا کو آواز دی جب وہ اپنے کام کے بیچ میں ہی تھا۔

"وے باکھیا لے، یہ تیری روٹی نیچے آرہی ہے۔" اور اس نے روٹی اس کی طرف نیچے پھینک دی۔

باکھا نے جھاڑو ایک طرف رکھی اور جیسا کہ وہ تھا، ایک اچھے کرکٹ کا کھلاڑی بننے کی کوشش کرتے ہوئے، روٹی کو پکڑنا چاہا مگر پتلی، کاغذ کی طرح کی روٹی ہوا میں تیر گئی اور پتنگ کی طرح گلی کے اینٹوں کے فرش پر گر گئی۔ اس نے اسے خاموشی سے اٹھا لیا اور جھاڑو کر اسی کپڑے میں دوسری روٹی کے ساتھ لپیٹ کر رکھ لیا جو اسے پہلے مل چکی تھی۔ وہ اتنا تنگ آچکا تھا کہ اس کے بعد اس کا دل نالی کو صاف کرنے کا نہیں رہا خاص طور پر جب وہ چھوٹا بچہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا ٹٹی پھر رہا تھا۔ اس نے جھاڑو ایک طرف پھینک دی اور عورت کو "بڑی مہربانی ماں جی" کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔

"دیکھا ان کے اب کتنے پر لگ گئے ہیں!" وہ عورت اس کے اِس طرح جانے پر چڑ کے بولی "یہ اب زیادہ سے زیادہ سر پھرے ہوتے جا رہے ہیں!"

"اماں میں کر چکا" اس کا لڑکا چلّایا

"بیٹا اگر تجھے ساتھ ہی اچار والے کی دکان پر دھونے کے لیے کوئی پانی دینے والا نہیں ہے تو زمین پر رگڑ کر صاف کر لے!" اور یہ کہہ کر وہ رسوئی میں واپس چلی گئی۔

آج صبح کا غصہ ہی باکھا کے دماغ سے گیا نہیں تھا کہ اب اِس تازہ بے عزتی سے اس کا خون اور کھولنے لگا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھا تھا تو صبح کی ناخوشگوار یادیں اب اسے نہیں ستا رہی تھیں لیکن اب پھر اُس کے سر کے پیچھے کچھ درد سا ہو رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈیوں میں سے ایک خاص گرمی اوپر چڑھتی جا رہی تھی جو اس کے جسم کے خون کو خشک کر کے اس کے چہرے کو پچکا رہی تھی۔ "کاش وہ بات مندر میں نہ ہوتی" وہ اپنے آپ سے بولا "تو سوہنی ہی روٹی لینے کے لیے آتی۔ میں کیوں گلی میں آ گیا؟" وہ پھر ایک مدہوشی کے سے عالم میں پہنچ گیا۔ اگرچہ باکھا سیاہ رنگ کا میلا کچیلا تھا مگر پھر بھی اس کے باہر کے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اس کی اپنی ساکھ اور طور طریقے تھے اور اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ "مجھے گلی کے فرش پر سے روٹی نہیں اٹھانی چاہیئے تھی" اس نے کہا اور ایک آہ بھری۔ اِس سے اس کا تناؤ کچھ کم ہو گیا۔

اس اثنا میں اسے بھوک لگنے لگی جیسے چوہے اس کے پیٹ میں کھانے کی تلاش میں دوڑ رہے ہوں۔ اس نے نیچے مٹی میں تھوکا اور گھر کی طرف تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے اور جوں ہی وہ باہر کھلی فضا میں آیا اسے محسوس ہوا کہ اس کی پگڑی کے نیچے سے پسینہ اس کے چہرے پر ٹپک رہا تھا۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اس کے سر پر آ گیا تھا۔ اس خیال سے کہ سورج چڑھ رہا تھا وہ تیز تیز چلنے لگا۔ اس کے اندر وقت بتانے لگانے کی کوئی زبردست حس تھی۔ یوں تو اس کی دوسری حسیں بھی کافی مضبوط تھیں۔ "میں گھر اپنی بغل میں صرف چپاتیاں دبا کر کیسے جا سکتا ہوں!" اسے محسوس ہوا "باپو تو یہ ضرور پوچھے گا کہ کیا میں کوئی مزے دار کھانے کی

چیز بھی لایا ہوں۔ اِس میں میرا کیا قصور ہے کہ مجھے صرف دو روٹیاں ملی ہیں۔ وہ یہ بھی ضرور پوچھے گا کہ سوہنی گلی میں روٹی لینے کیوں نہیں گئی۔ مجھے اسے ساری کہانی بتانی پڑے گی۔ وہ ناراض ہو جائے گا۔" اسے یاد آیا کہ جب وہ بچہ تھا تو باپ نے اسے اس بات پر گالیاں دی تھیں کہ اس نے آکر باپ کو یہ کہہ دیا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے ڈرایا تھا۔" باپو ہمیشہ دوسروں کی طرف داری کرتا ہے۔ اپنے گھر والوں کی کبھی نہیں میں اسے بچاری کی بات کیسے بتا سکتا ہوں ؟ اسے یقین نہیں آئے گا۔ اور اگر میں نے اسے بازار میں اپنے ساتھ ہوئے واقعے کا ذکر کر دیا تو وہ آگ بگولہ ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ جس دن میں تجھے کام کرنے کے لیے شہر بھیج دیتا ہوں تو جا کر جھگڑا کھڑا کر لیتا ہے۔ تو ٹھیک طرح سے کام کرنا کب سیکھے گا۔" باکھا نے سوچا کہ وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے کی بجائے جھوٹ بول دے گا۔" لیکن اسے پتہ تو ہر حالت میں لگ جائے گا کیونکہ سوہنی روٹی لانے نہیں گئی۔ اس نے سوہنی سے ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ گھر اتنی جلدی کیسے آگئی تھی۔ شاید سب سے اچھی بات یہی ہوگی کہ میں کچھ نہ کہوں۔ لیکن وہ تو ضرور پوچھے گا۔ ارے چھوڑو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اور اس نے اپنے ذہن سے یہ سب خیالات نکال دئے اور ایک اڑتے ہوئے عقاب اور بادلوں کے کچھ ٹکڑوں کو دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔

باکھا کا دل اتنی باتوں سے بھرا ہوا تھا کہ اس کا گھر کا راستہ لمبا نہیں لگا۔ وہ اپنے گھر والوں کو گھر کے آگے دھوپ سینکتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ بھنگیوں کی گلی میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے یہاں رہنے والے اپنی راتیں سخت اندھیرے اور اپنے تنگ مکانوں میں چولہوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں گزار کر جو نقصان سہتے تھے اس کی تلافی اپنا زیادہ وقت کھلی ہوا اور دھوپ میں گزار کر کر لیتے تھے۔ گرمیوں میں البتہ یہ بڑا مشکل ہوتا تھا اگرچہ وہ بان کی ان چارپائیوں کو جن پر وہ رات کو سوتے تھے لٹکا کر سایہ کر لیتے تھے اور چارپائیوں پر بوریوں کے ٹکڑے اور دوسرا کباڑ ڈال دیتے تھے۔ وہ دن بھر اس کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔ جاڑوں میں وہ سورج نکلتے ہی گھر سے باہر آجاتے تھے اور دھوپ میں شام تک یا ٹھنڈ پڑنے تک رہتے تھے۔ سوہنی ابھی تک اُسی رسوئی کو استعمال کرتی تھی جسے اس کی ماں نے اپنے گھر

کے دروازے کے ساتھ بنالیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے قاعدے کے مطابق تو اسے رسوئی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس وقت کے صفائی کے قانونوں کے مطابق جو ہندو پاکیزگی کی پہچان تھے اس میں چار لائینیں کھینچ کر چوکا نہیں بنایا گیا تھا۔ انگیٹھی یا چولہے کے پاس ہی ایک کنستر، دو گھڑے، ایک خالی کوڑے کی ٹوکری اور دو جھاڑو رکھی رہتی تھیں۔ دو چینی کے تام لوٹ اِدھر اُدھر لڑھکے پڑے رہتے تھے۔ زیادہ تر برتن مٹی کے تھے جو چولہے کا دھواں لگ لگ کر کالے ہوگئے تھے اور جب سے باکھا کی ماں مری تھی، صاف بھی نہیں ہوئے تھے۔ سوہنی اس وقت چھوٹی اور ناتجربےکار تھی اور اسے گھر کے باہر کا اتنا کام کرنا پڑتا تھا کہ وہ گھر کے کام کی طرف لگ کر دھیان نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ پانی کی قلت رہتی تھی اور اپنے پیشے کی وجہ سے اور اس گندے ماحول کے سبب جس میں رہنے پر وہ مجبور تھے۔ انھیں تو ایک گھڑے سے زیادہ پانی کی ضرورت تھی لیکن انھیں اتنا مل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ اِس کے بغیر ہی گزارہ کرتے تھے حتیٰ کہ صفائی، صحت کے اصول اور اِس طرح کی باتیں ان کے لیے بےمعنی ہوگئیں۔

"راکھا کہاں ہے؟" باکھا نے اپنی بہن کو کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹی تھماتے ہوئے کہا۔

وہ چپ رہی لیکن اس کے باپ لاکھا نے جواب دیا۔

"وہ بدمعاش بارکوں میں لنگر سے روٹی لانے گیا تھا!"

بوڑھا اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا جو اب رسوئی کے پاس تک بچھا ہوا تھا اور اپنے حقے پر کش لگا رہا تھا اور ہر کش دمے کی ایک چھوٹی سی کھانسی تھی۔ وہ کافی بنا سنورا لگ رہا تھا اور ظاہرہ طور پر وہ جمعی سے جسے وہ اپنے تکیے کے نیچے ایک زمانے سے ایک زنگ آلود آئینے کے ساتھ رکھتا تھا، اپنے چہرے کے بےکار کے فالتو بال اکھاڑتا رہا تھا کیونکہ اس کی سخت سفید داڑھی دونوں طرف سے اور کناروں پر سے ترشی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آج نرمی کی جھلک تھی، شاید اِس وجہ سے کہ آج کی صبح اس کی کافی آرام سے کٹی تھی۔ لیکن اس کی صفائی سے بندھی ہوئی نیلی پگڑی کے نیچے اس کی پیشانی پر کچھ بل پڑے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

اس لیے ضرورت پڑنے پر غصہ اور غصے سے بھڑک جانا اس سے دور نہیں تھا۔

"کیا تو کوئی مزیدار چیز کھانے کے لیے لایا ہے؟" اس نے باکھا سے پوچھا۔

"میرا تو اچار، پالک اور مکی کی روٹی کھانے کو جی کر رہا ہے۔"

"میں تو صرف دو چپاتی لایا ہوں" باکھا نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں وہ جذبہ بھی پھر بیدار ہو گیا کہ باپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دے یا جھوٹ بول دے۔

"تو تو بالکل نکما شیطان ہے" لاکھا بڑبڑایا "دیکھو وہ شیطان بارکوں سے کوئی بڑھیا چیز کھانے کے لیے لاتا ہے یا نہیں۔"

اور اس کے یہ کہتے ہی جمعدار کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس کے ذہن میں پکے ہوئے کھانوں کے وہ بڑے بڑے ڈھیر گھوم گئے جو کبھی شہر کی گلیوں میں شادیوں کے موقعے پر اسے ملا کرتے تھے۔ پوری کچوریاں ہوتی تھیں، سبزیاں، تری والی اور خشک، سوجی کا حلوہ، مٹھائیاں اور مزے دار اچار جو اونچی ذات کے آدمیوں کی پتلوں کی جھوٹن ہوتی تھی۔ اور بعض دفعہ اسے سیدھا رسوئی سے ہی کھانا مل جاتا تھا۔ وہ ناقابلِ فراموش دن تھے اور لاکھا کے لیے تو وہ اتنی کشش رکھتے تھے کہ وہ اُن گلیوں کی ہر ایک لڑکی کی اٹھان پر نظر رکھتا تھا اور کام کرتے کرتے ان کے والدین سے پوچھ لیتا تھا کہ اُن کی شادی کی شبھ گھڑی کب آئے گی۔ شاید لاکھا کو ہی بُلاشاہ میں لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں شادی کے لیے ذمے دار مانا جائے گا۔ شادی کے لائق لڑکیوں کے والدین لاکھا کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور اسے پرانے کپڑے اور اچھی مقدار میں کھانے پینے کی چیزیں دیتے رہتے تھے۔ اسے ایک اور موقعہ یاد آیا جب وہ پلٹن جس کے ساتھ وہ لگا ہوا تھا لام پر سے واپس آئی تو اس کی واپسی پر بڑا شاندار جشن ہوا اور دعوتیں کی گئیں۔ لاکھا کو بھنگیوں کے جمعدار کی حیثیت سے سارے بچے کھچے کھانے کے سامان کو بانٹنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اسے یاد آیا کہ اُس سال وہ لکڑی کا صندوق جس میں مٹھائی رکھی رہتی تھی، کبھی خالی نہیں ہوا۔

"میں شہر میں لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتا اور میں نے ہر گھر میں روٹی

کے لیے آواز بھی نہیں لگائی" باکھا نے اپنے والد سے اپنی معذرت میں کہا۔ یہ بات سنتے ہی لاکھا کے سپنوں کا تا نا با نا بکھر گیا۔

"ارے تو تجھے جا کر ان سے واقفیت کرنی چاہیئے۔ بیٹے میرے مرنے کے بعد تو نے ان کے لیے ساری عمر کام کرنا ہے۔"

باکھا نے اپنی سوچ کی مضبوط قوتِ حس سے اپنی آنکھوں کے سامنے اس خوفناک مستقبل کا منظر کھینچ لیا جو ساری عمر اس شہر میں کام کرنے کا مطلب تھا اور ان تمام بے عزتیوں کا جو اس کا مقدّر بنیں گی۔ اس نے تصور میں ایک بھیڑ کو اس پر چلاّتے دیکھا۔ وہ صاف دیکھ سکتا تھا کہ ایک چھوٹے قد کا پنڈت اپنے بازوؤں کو ہوا میں اچھال کر چلاّ رہا تھا۔ "میں بھرشٹ ہوگیا۔ میں بھرشٹ ہوگیا!" اسے وہ عورت بھی نظر آئی جس نے اوپر سے روٹی اس پر پھینک دی تھی اور ساتھ ہی اس کو نالی نہ صاف کرنے پر برا بھلا بھی کہا تھا۔ "نہیں نہیں" اس کا ذہن اسے کہتا ہوا معلوم دیا "کبھی نہیں!" اور اس کے سامنے اُس باکھا کی ایک مبہم سی شکل ابھر آئی جو ملٹری کی اعلیٰ وردی پہنے ہوئے تھا اور انگریزوں کی بارکوں میں صاحب لوگوں کے کموڈ صاف کر رہا تھا۔ "ہاں میں یہ کرنا زیادہ پسند کروں گا۔" اس نے اپنے آپ سے اس تصویر کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

خوف اور نئی آرزو کا یہ عجیب وغریب مرکب تھا۔ کبھی وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا تھا اور کبھی وہ اس دنیا سے محبت کرنے لگتا تھا جسے دیکھنے کی اسے آرزو تھی۔ آدمی ایک جگہ کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر اس کو چاہنے لگتے ہیں اور پھر ایک ایسی منزل آتی ہے جب ایک ان دیکھی بیرونی دنیا کا تصور ان پہ چھا جاتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک نئے میل ملاپ کو جنم دیتا ہے اور وہ اس جانی پہچانی دنیا کو جو بہت زیادہ رہنے سے باسی اور بے کیف ہو جاتی ہے، پسند نہیں کرتے۔ جو ذہن ایک دفعہ اس نئی حیرت انگیز دنیا میں جھانک لیتا ہے اور شدید خواہش سے اس کے لامحدود تنوع کا احساس کر لیتا ہے، ایک مایوسی اور ناامیدی سے بھی جکڑا جاتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب زندگی کی تلخ حقیقت اس کے تصورات کے گھوڑے کو لگام دیتی ہے۔ لیکن یہی دنیا ان لوگوں کو کتنی خوشگوار لگتی ہے جو اسے کسی بچے کی طرح

پرامید اور حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باکھا کے جو عجیب وغریب شوق اور خواہشات تھیں انھیں سمجھا بھی جا سکتا تھا اور معاف بھی کیا جا سکتا تھا۔ اسے اپنا گھر، اپنی گلی، اپنا شہر کچھ بھی پسند نہیں تھا کیوں کہ وہ ٹامیوں کی بارکوں میں کام کر چکا تھا۔ اور اس نے ایک دوسری عجیب وغریب اور خوبصورت دنیا کی جھلک دیکھ لی تھی اور اب اس کے دیسی جوتے اس کے پاؤں کے لیے چھوٹے ہو گئے تھے اور ان میں اب وہ فوجی بوٹ اچھے لگتے تھے جو اس نے مفت میں حاصل کر لیے تھے۔ ان کے اور پوشاک کی دوسری بدیسی اشیا کے ساتھ اس نے اپنی ایک نئی دنیا بنا لی تھی جو کسی اور وجہ سے نہیں تو اس وجہ سے قابلِ تعریف تھی کہ وہ پرانے بوسیدہ نظام اور سڑتی ہوئی زندگی کی روایتوں سے جن میں وہ پیدا ہوا تھا ایک تبدیلی کی نمائندگی کرتی تھی۔ وہ اپنے طریقے سے اس تبدیلی کو شروع کرنے والا پہلا آدمی تھا اگرچہ وہ خود پہلے آدمی ہونے کے مفہوم سے ناواقف تھا اور اس کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ یہ اصطلاح اس کے لیے استعمال کی جا سکتی تھی۔

"تجھے آج کیا ہو گیا ہے" باکھا کے باپ نے لڑکے کے روکھے پن اور اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک دیکھ کر پوچھا "کیا تو تھک گیا ہے؟"

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں؟" اس کے باپ نے دہرایا "کوئی تو بات ضرور ہے۔ آ مجھے سچ سچ بتا دے۔"

باکھا نے محسوس کیا کہ اگر اس نے راز کو چھپانے کی مزید ضد کی تو وہ رو پڑے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا۔ اس کے باپ نے جس طریقے سے اس سے ہمدردی ظاہر کی اس نے اس کے دل کو چھو لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ مزید اپنی ضد کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے وہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑا اور یہ اتنا اچانک ہوا کیونکہ وہ عام طور پر اس طرح سے بولنا پسند نہیں کرتا تھا۔

"آج صبح لوگوں نے میری بڑی عزتی کی اور مجھے گالیاں دیں کیونکہ جب میں چل رہا تھا تو ایک آدمی مجھ سے چھو گیا۔ اس نے میرے ایک ٹکّہ مارا۔ میرے گرد

ایک بھیڑ اکٹھی ہو گئی اور سب نے مجھے گالیاں دیں۔ ۔ ۔ ۔" وہ آگے نہیں بول سکا۔ وہ اپنے آپ کو نفرت کرنے کے جذبے سے مغلوب ہو گیا۔

"کیا" لاکھا غصے اور ہمدردی کی ایک زبردستی پیدا کی ہوئی آمیزش سے بولا "کیا تو نے اپنے آنے کی آواز نہیں لگائی تھی؟"

اس سوال نے باکھا کی روح کو خاک کر دیا۔ اب وہ یہ سوچ کر بڑا آزردہ تھا کہ اس نے اپنے باپ کو جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا سب بتا دیا تھا۔ "مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے اسے کم بتایا تو بھی وہ یہی سوال کرے گا" اس نے سوچا۔

یہ دیکھ کر کہ اس کا لڑکا بڑا گھبرایا ہوا تھا، لاکھا نے ناراض ہونے کی بجائے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی ۔۔۔ " بتا میرے بچے تو نے احتیاط کیوں نہیں برتی؟"

"لیکن بابو اس کا فائدہ؟" وہ چلا کر بڑا " اگر ہم آواز بھی لگائیں گے تب بھی وہ ہمارے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم رذیل ہیں، کیونکہ ہم ان کی گندگی صاف کرتے ہیں۔ مندر کے اس پنڈت نے سوہنی کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے کی کوشش کی اور پھر بھرشٹ ہو گیا، بھرشٹ ہو گیا چلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ ساروں کی گلی میں اس بڑے گھر کی عورت نے مجھ پر چوتھی منزل سے روٹی پھینکی۔ میں اب شہر میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں اب یہ کام کبھی نہیں کروں گا۔"

لاکھا کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ، جیسے اسے اپنی ہستی کا احساس ہو، اس کی مونچھوں کے کناروں پر پھیل گئی، اس کے بے اثر کمزور غصے کی مسکراہٹ۔

"بول تو نے تو گالی نہیں دی؟ یا جواب میں ہاتھ تو نہیں اٹھایا؟" اس نے پوچھا۔ اس سوال کے پوچھنے میں اپنے بیٹے کے لیے خوف کا جذبہ کارفرما تھا کیونکہ اگر اس کا بیٹا ایسا کرتا تو اس جرم کے خطرناک نتائج ہو سکتے تھے۔ اس جذبے میں خدمت گزاری اور غلامی کا وہ عجز بھی ملا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اونچی ذات کے آدمیوں کے خلاف بدلہ لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

"نہیں۔ لیکن بعد میں مجھے اس کا بڑا افسوس ہوا کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔" باکھا نے جواب دیا۔ "میں بھی تھوڑا سا اپنے دل کا غبار نکال سکتا تھا۔"

"نہیں نہیں میرے بیٹے نہیں" لاکھا بولا "ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ پولیس کے سامنے ہم چاہیں کچھ بھی کہیں، مگر اُن کا ایک لفظ ہماری ساری بات ختم کر دے گا۔ وہ ہمارے مالک ہیں۔ ہمیں ان کی عزت کرنی پڑے گی اور وہ ہمیں جو کہیں گے کرنا پڑے گا۔ ان میں سے کچھ تو بڑے رحم دل ہیں۔"

اس نے اپنے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ لمحے پہلے جو اس کے چہرے پر واضح تناؤ تھا وہ اب کچھ کم ہو گیا تھا اور ایک لاابالی پن میں بدل گیا تھا جیسے اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن بوڑھے نے یہ بھانپ لیا کہ وہ بہت دکھی اور ستایا ہوا تھا اور اس نے یہ بھی اندازہ کر لیا کہ اسے اونچی ذات کے لوگوں سے نفرت تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کے دکھ کو کم کرنے اور اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ذرا سن" اس نے اپنے آپ کو ایک بھدے بوڑھے کی سطح سے جو وہ تھا ایک معمر باپ کے اعلیٰ مرتبے تک اٹھا کر کہا، "جب تو ایک چھوٹا سا بچہ تھا تو مجھے بھی ایک بڑا برا تجربہ ہوا۔ تجھے بخار تھا اور میں اسی شہر میں حکیم بھگوان داس کے گھر پر گیا۔ میں زور زور سے چلایا لیکن کسی نے بھی نہیں سنا۔ ایک بابو ڈاکٹر کے دواخانے میں سے گزر رہا تھا اور میں نے اس سے کہا۔

"بابو جی بابو جی۔ پرماتما تمہارا بھلا کرے گا۔ مہربانی کر کے میری بات حکیم صاحب تک پہنچا دو۔ میں بڑی دیر سے چلا رہا ہوں اور میں نے کچھ لوگوں کو بھی حکیم صاحب کو بتانے کو کہا کہ میری ان سے ایک عرض ہے۔ میرا بچہ بخار میں بھن رہا ہے۔ وہ کل رات سے بے سدھ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ حکیم صاحب اس کے لیے کوئی دوا دے دیں۔"

"پرے ہٹ، پرے ہٹ" بابو بولا "میرے اوپر چڑھتا مت چلا آ۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ آج صبح مجھے دوبارہ اشنان کرنا پڑے؟ حکیم صاحب کو پہلے ان لوگوں کو دیکھنا ہے جنھیں دفتر جانا پڑتا ہے اور ان کی ہی کافی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ کسی اور وقت آئیو یا انتظار کر۔"

اور یہ کہہ کر وہ دواخانے میں چلا گیا۔

"میں کھڑا رہا۔ جب کبھی کوئی وہاں سے گزرتا تو میں اس کے پاؤں میں اپنا سر رکھ دیتا اور اسے کہتا کہ حکیم صاحب کو بتا آؤ۔ لیکن بھنگی کی کون سنتا؟ ہر ایک آدمی کو اپنی

ہی پڑی تھی۔"

"میں اسی طرح ایک کونے میں ایک گھنٹے تک کوڑے کے اس ڈھیر کے پاس کھڑا رہا جسے میں نے اکٹھا کیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بچھو مجھے کاٹ رہا ہے۔ مجھے اس خیال سے بڑی تکلیف ہو رہی تھی کہ میں اپنے بیٹے کے لیے دوا نہیں خرید سکتا تھا اگرچہ میں اپنی محنت کی کمائی اس کے لیے خرچ کرنے کو تیار تھا۔ میں نے حکیم جی کے گھر میں دوا سے بھری ہوئی بہت سی شیشیاں دیکھی تھیں اور مجھے پتہ تھا کہ ان میں سے کسی ایک شیشی میں تیرے لیے بھی دوا ہو گی لیکن میں اسے خرید نہیں سکتا تھا۔ میرا دل تیرے ساتھ تھا اور میرا جسم حکیم کے گھر کے باہر تھا۔ میں نے اپنا دل چیر کر اس کمرے سے نکال لیا تھا جہاں تو اپنی ماں کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور میں نے پرماتما سے دعا مانگی کہ میری مشکل آسان بنا دے۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ تو مر رہا تھا۔ ایسا لگا کہ کوئی میری بغل میں مکا مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ آ اور اپنے بیٹے کا چہرہ آخری دفعہ دیکھ لے۔ اور میں گھر کی طرف دوڑ پڑا۔"

"تم دوا لے آئے؟" تیری ماں نے میری طرف لپکتے ہوئے پوچھا

"تو نے اپنی آنکھیں آدھی کھولیں۔ تو اتنی غنودگی یا بے ہوشی میں تھا کہ مجھے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تجھے جلد ہی فرش پر اتار دیں گے جیسے ہندوؤں میں کسی مرنے والے کو اس کی آخری گھڑیوں میں اتار دیتے ہیں۔ میں پھر حکیم کے گھر کی طرف دوڑا۔ تمہاری ماں چلائی اور بولی "اب دوا کا کیا فائدہ ہے؟" لیکن میں دوڑتا چلا گیا۔ جب میں حکیم کے گھر پر پہنچا تو میں نے پردہ اٹھایا اور سیدھا اندر گھس گیا میں نے حکیم کے پاؤں پکڑ لیے اور بولا۔" میرے بچے کے جسم میں ابھی تک ذرا سا سانس باقی ہے۔ حکیم جی میں ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ میری زندگی کا مطلب میرا بچہ ہے۔ حکیم جی رحم کرو۔ پرماتما آپ کا بھلا کرے گا۔"

"بھنگی بھنگی" سارے دواخانے میں ایک شور مچ گیا۔ حکیم کے پاؤں بھرشٹ ہوتے ہی لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حکیم کا چہرہ کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو رہا تھا اور وہ اپنی پوری طاقت سے چلایا، "چنڈال تو کس کے حکم سے اندر چلا آیا؟ اور پھر تو ہاتھ جوڑتا ہے اور میرے پاؤں پڑتا ہے؟ اور کہتا ہے کہ تو ہمیشہ کے لیے غلام بن جائے گا؟

تو نے میری سینکڑوں روپے کی دوائیں بھرشٹ کر دیں۔ کیا تو ان کی قیمت دے گا؟"

"میں نے آنسو بہانے شروع کر دئے" لاکھا نے آگے سناتے ہوئے کہا اور بولا "مہاراج، میرے مالک! میں بھول گیا، تمہارا جوتا میرے سر پر۔ مجھے ہوش نہیں ہے۔ مہربانی کر کے چل کر میرے بچے کو کوئی دوا دے دو۔ مہاراج تم میرے مائی باپ ہو۔ میرے آنے سے جو دوا خراب ہو گئی اس کا پیسہ تو میں نہیں دے سکتا۔ مگر میں آپ کی سیوا کر سکتا ہوں۔ مہربانی کر کے میرے بچے کو بچا لو۔ وہ موت کے بستر پر ہے۔"

حکیم جی نے اپنا سر ہلا دیا اور زور سے بولا۔ "میری سیوا کرے گا! میری! تو میری سیوا کیا کر سکتا ہے؟ کیا تجھے اس دواخانے سے کبھی کوئی دوا ملی ہے جو اس طرح سے بھاگتا ہوا اندر چلا آیا؟"

"میں نے کہا سرکار میں کچھ دیر باہر کھڑے رہ کر چلا گیا تھا۔ میں نے ہر راہ گیر کے پاؤں میں پڑنے کی کوشش کی اور ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ سرکار کو جناب والا کو بتا دیں کہ میرا بچہ بیمار ہے۔ لیکن سرکار یہی دیا کا وقت ہے، اس وقت مہربانی کرو۔ کسی اور وقت تم میری جان بھی لے لینا۔ صرف میرے بچے کو بچا لو۔ ساری رات میں اسے اپنی بانہوں میں لیے پھرا ہوں اور سوچتا رہا کہ اگر اس نے رات کاٹ لی تو سورج نکلتے ہی میں تمہارے پاس آکر دوا لے جاؤں گا۔ اگر میں آدھی رات کو یہاں آکر آواز لگاتا تو میری کون سنتا؟"

"یہ سن کر حکیم کا دل کچھ پگھلا اور اس نے نسخہ لکھنا شروع کر دیا۔ اسی وقت تیرا چچا بھاگتا ہوا آیا اور باہر سے ہی چلّایا۔ "او لاکھا، او لاکھا۔ تیرا لڑکا مر رہا ہے۔"

"میں باہر بھاگا۔ حکیم جی نے اپنا قلم نیچے رکھ دیا تھا۔ جب میں گھر آیا تو میں نے دیکھا کہ تیری حالت بڑی بگڑ گئی تھی اور تجھے فرش پر چوتھی بار اتار لیا گیا تھا اور تیری ماں بری طرح رو رہی تھی۔"

"تھوڑی سی دیر میں دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ ذرا سوچو تو کون تھا۔ تیرا چچا باہر جاتا ہے اور کیا دیکھتا ہے کہ حکیم جی خود ہمارے گھر پر پدھار رہے ہیں۔ وہ ایک نیک آدمی تھے۔ انھوں نے تیری نبض دیکھی اور تجھے دوا دے کر تیری جان بچا دی۔"

"لیکن وہ مجھے مار بھی تو سکتا تھا" باکھا نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"نہیں نہیں" لاکھا بولا "یہ لوگ واقعی بڑے مہربان ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہ تو ان کا دھرم ہے جو انھیں ہمیں چھونے سے روکتا ہے"!

لاکھا نے اپنی تمام داستان میں اپنی کمتری کے احساس اور اپنی قسمت کے قانون کو عاجزی سے تسلیم کرنے کو کبھی نہیں چھوڑا۔

اپنے باپ کا قصہ سن کر باکھا کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ جب بھی اس کا باپ اس کا نام لیتا اور جب کبھی وہ اس کی خطرناک بیماری کا ذکر کرتا، باکھا کے سارے وجود میں کمتری اور اپنی افسوسناک حالت کی لہر سی دوڑ جاتی اور وہ بیک وقت ایک حرارت اور ٹھنڈک محسوس کرتا، اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑتے۔ وہ صرف اپنی قوت ارادی سے آنسوؤں کو گرنے سے روک کر اپنی کمزوری کو چھپانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن کچھ لمحوں میں ہی وہ سنبھل گیا اور اس نے اپنے آپ پھر پہلے سا طاقتور محسوس کیا۔

"یہ بدمعاش راکھا ضرور کہیں اِدھر اُدھر کھیلنے چلا گیا ہوگا" بوڑھا بڑبڑایا۔ "تم لوگوں نے کھانا ہو یا نہیں مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔ سوہنی لا مجھے تو رکھی ہوئی روٹی دیدے"!

"چٹنی پیاز کچھ نہیں ہے" سوہنی بولی "صبح کی بچی ہوئی کچھ چائے ہے، اس کے ساتھ دے دوں؟"

"درویشوں کے لیے ذائقے کے کیا معنی ہیں، چاہے دودھ ملائی ہی کیوں نہ ہو" بوڑھے نے جواب میں یہ مشہور ہندوستانی کہاوت سنا دی۔

سوہنی دھواں آلود مٹی کی ہانڈی کو جس میں چائے کی پتی، چینی اور دودھ پڑا تھا چولہے پر رکھنے کے لیے اٹھی۔

باکھا ٹین کے ایک لمبے سے گلاس پر جھکا اور اپنے ہاتھوں اور چہرے پر پانی چھڑکا۔ اس نے اپنے باپ کو روٹی مانگتے سن لیا تھا اور اسے یہ کچھ برا لگا۔

"میں بھی تو بھوکا ہوں" اس نے سوچا۔ "شاید باپو سے کہیں زیادہ۔ وہ تو سارا دن یہیں بیٹھا رہا تھا" لیکن باکھا بڑا رحمدل اور قربانی کرنے والا تھا اور وہ یہ

خیال بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے روٹی کھانے کا برا مانے گا۔ لیکن اس کے اندر ایک بے زاری کا جذبہ پھر بیدار ہوا، اُس وقت کے خلاف نہیں جو وسیع پیمانے پر انسانی زندگی کو چاہے وہ مفید ہو نہیں، آگے بڑھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ ایک نوجوان، تندرست اور طاقتور آدمی تھا جس کا جسم بڑا گٹھیلا تھا اور اس کے مقابلے میں اس کا بوڑھا باپ تو مرے ہوئے کے برابر تھا، ایک سڑتی ہوئی لاش جیسے کسی آوارہ کتے یا بلی کی لاش کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑی رہتی ہے۔

آخر کار راکھا بھی آتا ہوا نظر آگیا۔ اس کے منڈے ہوئے ننگے سر پر کھانے کی ٹوکری تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فرائی پین رسی سے لٹکا ہوا تھا اور اس کے پاؤں میں باکھا کے پرانے، بغیر فیتے کے فوجی بوٹ تھے جو اس کے پاؤں میں ڈھیلے ہونے کی وجہ سے آواز کر رہے تھے۔ اس کی پھٹی ہوئی فلالین کی قمیض جو بار بار اس کی بہتی ہوئی ناک کو پونچھنے کی وجہ سے بڑی گندی ہو رہی تھی، اس کے چلنے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ اس وجہ سے جو بے آرامی اسے ہو رہی تھی کچھ اس کے سبب اور کچھ تھکاوٹ کی وجہ سے چاہے وہ بناوٹی ہو یا صبح کام کرنے کی وجہ سے اصلی ہو، اس کا گندا چہرہ لٹکا ہوا لگ رہا تھا اور اس کے جبڑے قدرے کھلے ہوئے تھے اور ہونٹوں کے دونوں کونوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور تنگ پیشانی کی وجہ سے اس کی عجیب سی شکل واضح طور پر بدصورت تھی۔ مگر وہ اپنے کانوں سے جو لمبے تھے اور جن کی آر پار سورج کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا، ذہین اور ہوشیار لگتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے بھنگیوں کی بستی کا لڑکا معلوم ہوتا تھا جہاں نہ نالیاں ہوتی ہیں، نہ روشنی، نہ پانی یعنی اس دلدل کا جہاں لوگ شہر والوں کی ٹٹیوں کے درمیان رہتے ہیں اور اپنے ہی فضلے کی بدبوئیں، جو چاروں طرف، یہاں اور وہاں، پڑا رہتا ہے اور راتیں سیاہی کی طرح گہری کالی ہوتی ہیں۔ راکھا اسی گندی دھرتی پر پلا تھا۔ اس کی دلدل کے کیچڑ میں نہایا تھا۔ اُس کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں میں کھیلا تھا۔ اس کے چلنے کا یہ بھدا طریقہ اور اس کے طور اطوار اس کے ماحول اور گرد و پیش کا نتیجہ تھے۔ اس کے جسم میں وہ زندگی تھی جو کبھی شرارہ نہیں بنتی، کبھی نقطۂ تکمیل پر نہیں پہنچتی۔ اس کی ہڈیوں میں ملیریا گھسا ہوا تھا اور وہ بیماری مارتی نہیں مگر طاقت زائل کر دیتی ہے۔

بچپن سے ہی وہ مچھروں اور مکھیوں کا دوست تھا اور ان کا اور اس کا گہرا ساتھ تھا۔

"تو آخر تو، آ ہی گیا۔" باکھا اسے نزدیک آتے دیکھ کر دور سے ہی بولا۔

چھوٹے بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بگڑے ہوئے چہرے سے رسوئی میں بیٹھی ہوئی سوہنی کے پاس کھانے کی ساری چیزیں رکھ کر نیچے زمین پر بیٹھ گیا اور کھانے کی ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر بچے کھچے ٹکڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دو بڑے بڑے ٹکڑے کھائے اور اس کا منہ ایک طرف سے بھر گیا۔ وہ اس طرح کھاتے ہوئے بہت برا لگ رہا تھا۔

"او جنگلی جانور۔ کم از کم اپنے ہاتھ تو دھولے۔" باکھا نے اپنے بھائی کی بہتی ہوئی ناک کو دیکھ کر چڑتے ہوئے کہا۔

"تو اپنا کام کر" چھوٹے بھائی نے چلا کر جواب دیا جیسے کہ وہ اپنے تحفظ میں اپنی اخلاقی طاقت کی ٹھوس بنیاد کا سہارا لے رہا تھا۔ اور بات بھی واقعی ایسی ہی تھی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس کا باپ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ باکھا کے مقابلے میں اس سے زیادہ پیار کرتا تھا۔

"ذرا شیشے میں اپنا منہ دیکھ۔ کیسی اچھی شکل ہو رہی ہے۔" باکھا بولا "اب اس کے نقص ہی نہ نکالتا رہ" لاکھا بیچ میں بول پڑا "کبھی تو اپنی لڑائی بند کر دیا کر۔"

"آ روٹی کھالے" سوہنی نے اپنے بڑے بھائی سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

باکھا بے دلی سے اپنی کرسی پر سے اٹھا اور رسوئی کے کنارے پر جھکتے ہوئے اس نے لاپرواہی سے ٹوکری میں ہاتھ ڈال دیا۔ کھانے کی کافی چیزیں اس میں تھیں، چپاتیوں کے ٹکڑے، کچھ ثابت روٹیاں بھی اور ایک برتن میں دال بھی۔

وہ سب اسی ٹوکری میں سے اور اسی برتن میں سے کھاتے رہے اور ہندوؤں کی طرح الگ الگ طشتریوں میں ڈال کر نہیں کھایا کیونکہ اُن کا ہندوؤں والا صفائی کا جذبہ تو مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا۔ صرف باکھا کو پہلی دفعہ کھانے کے چند لقمے کھانے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کے لیے اس کی گندگی کی وجہ سے نفرت کا سا احساس ہوا۔ وہ

تھوڑا سا ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گیا اور اُس کی پیٹھ اس کے بھائی کی طرف ہو گئی۔ لیکن اب کے اس کے ہاتھ میں چپچپی گیلی روٹی کا ٹکڑا آ گیا۔ وہ ٹوکری سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے سامنے ایک سپاہی کے پیتل کے برتن میں روٹی کے ٹکڑوں اور بچے کھچے سالن کے اوپر ہی اپنے ہاتھ دھونے اور پھر اس جھوٹن کو راکھا کی ٹوکری میں پھینکنے کی تصویر کھنچ گئی۔ وہ خود بھی کئی دفعہ روٹی مانگنے گیا تھا اور جس چیز سے اسے نفرت تھی وہ یہی پانی پڑے ہوئے روٹی کے گیلے ٹکڑے تھے۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اس کے منہ میں زبان کے نیچے چاروں طرف سے پانی آرہا ہے۔ اس کی طبیعت بڑی خراب ہوئی۔ اس نے وہ گیلی روٹی اپنے ہاتھ سے گرانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی کچھ اس کی انگلیوں سے چپک گئی۔ اس کا جی متلانے لگا اور وہ فرش پر سے اٹھ گیا۔

"تُو تو کہہ رہا تھا کہ تو بُھوکا ہے۔" لاکھا بولا جب اس نے دیکھا کہ باکھا کھاتے کھاتے اٹھ گیا تھا۔ باکھا ٹین کے اسی برتن پر جھک گیا جس میں سے اس نے اپنے ہاتھ دھوئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جواب میں کیا کہے۔ "اگر میں اسے کہتا ہوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو وہ سمجھے گا نہیں۔ میں کوئی بہانہ بنا دیتا ہوں، لیکن کیا؟..." اچانک اسے ایک بہانہ سوجھ گیا۔

"مجھے رام چرن کے گھر اس کی بہن کی شادی دیکھنے جانا ہے۔ وہاں سے مجھے اپنے حصّے کی مٹھائی بھی لانی ہے۔" وہ بولا۔ آخری بات اس نے ہوشیاری سے بوڑھے کو للچانے کے خیال سے جوڑ دی تھی تاکہ وہ اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

تاہم اس کے اس اچانک جذبے کی صحیح وجہ، جو اس کی بہانہ تراشی میں اتنا مفید ثابت ہوا تھا، کسی کو پتہ نہیں تھی، شاید اسے خود کو بھی نہیں۔ کیونکہ وہ بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ رام چرن کی بہن کی شادی دیکھنے کیوں جا رہا تھا۔ اسے گلابو نے بلاوا بھی نہیں بھیجا تھا۔ وہ لڑاکی تھی اور وہ اِس وجہ سے بھی باکھا کو نہیں بلا سکتی تھی۔ وہ باکھا جیسے شریف لڑکے کو گالیاں بھی دیتی تھی کیونکہ وہ اس کے بیٹے کو کام سے بھاگ جانے میں اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔ اور نہ رام چرن ہی اسے بلا سکتا تھا اور نہ اس سے رام چرن کی بہن ہی کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ تو جب سے دس سال کی ہوئی تھی اس سے بولی

تک نہیں تھی۔ تو پھر وہ کیوں جارہا تھا؟ تو پھر اس نے اچانک یہ ہمت کرنے کا فیصلہ کیوں کرلیا تھا؟

وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ گھر سے، اپنے باپ، اپنے بھائی، اپنی بہن، ہرایک سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ خود سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ رام چرن کی بہن کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ماضی سے ابھر کر اس کی ایک تصویر ابھر آئی۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جس کا سر منڈا ہوا تھا اور وہ کافی گہرے سرخ رنگ کا سفید نقش و نگار والا چھوٹا سا لہنگا پہنے ہوئے تھی جو دھوبنیں پہنتی ہیں۔ وہ کسی مداری کی چھوٹی سی بندریا لگ رہی تھی۔ وہ خود بھی اس وقت آٹھ سال کا تھا اور سنہری کام والی ٹوپی پہنے رہتا تھا جو اس کے باپ نے بیاج پر روپے دینے والے ایک سپاہی سے مانگ لی تھی۔ اس سپاہی کے تین بیٹے تھے اور ان کی پھٹی پرانی چیزیں لاکھا کے تینوں بچوں کے بالکل ٹھیک آتی تھیں۔ باکھا کو یاد آیا کہ ایک دفعہ جب وہ بارکوں میں اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹا سے کھیل رہا تھا تو وہ سب گھر آگئے تھے اور شادی کا کھیل کھیلنے لگے تھے۔ اس کھیل میں رام چرن کی چھوٹی بہن کو دلہن بنایا گیا تھا کیونکہ وہ لہنگا پہنے ہوئے تھی۔ باکھا کو دولہا بننے کے لیے کہا گیا تھا کیونکہ وہ سرخ کام کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ دوسرے سارے لڑکے براتی بن گئے تھے۔ باکھا کو یاد آیا کہ چھوٹا نے اسے ایک سرمنڈی ہوئی چھوٹی سی واہیات لڑکی کا دولہا بننے پر کتنا چھیڑا تھا اور باکھا اس پر کتنا ناراض ہوگیا تھا اگرچہ باکھا کو بھی پتہ تھا کہ وہ دولہا کے طور پر کتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ لیکن رام چرن کی بہن میں ایک خاص کشش تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی نرم روشنی تھی جس کی وجہ سے وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اسے یاد آیا، وہ اپنے دوست سے واقعی لڑ پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑی ہوکر ایک لمبی لڑکی بن گئی تھی اور اس کا چہرہ بھوری گیہوں کی طرح بھورا تھا اور اس کے بال پانی بھرے بادلوں کی طرح سیاہ ہو گئے تھے اور باکھا کو بڑا فخر تھا کہ وہ اس لڑکی کا کھیل میں دولہا بن چکا تھا۔ لیکن اس میں اتنی جھجک تھی اور وہ اتنا شرمیلا تھا کہ اس میں اسے نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں اس نے ہمیشہ اس کے خیال پر گھبراہٹ کی متعدد لہروں کا احساس کیا تھا۔ اب چودہ سال کی عمر میں ایک

نوجوان دھوبی سے اس کا بیاہ ہو رہا تھا جو ۲۱ پنجابی رجمنٹ میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایک سال پہلے اس رشتے کی بات سنی تھی۔ بھنگیوں کی بستی میں یہ بات عام سننے میں آئی تھی کہ گلابو نے اپنی لڑکی کا ہاتھ دینے کے لیے دو سو روپے وصول کر لیے تھے۔ یہ بات چھوٹا نے اسے بتائی تھی۔ اسے وہ شام یاد آئی جب اسے بھی اس بات کا پتہ لگا تھا کیونکہ اسے یہ سن کر صدمہ سا پہنچا تھا اور اس نے دل میں بڑا دکھ سا محسوس کیا جیسے کوئی چشمہ اس کے جسم کی سخت چٹان سے ٹکرا کر ایک دردناک گیت میں پھوٹ پڑا ہو۔ بعد میں بھی، ٹٹیوں پر اکتا دینے والا کام کرتے ہوئے، اس نے بار بار وہی دوری اور درد بھرا گیت سنا تھا۔ لیکن وہ کبھی یہ نہ جان سکا تھا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ رات کو اپنے گھر کے اندھیرے میں جب وہ آدھی نیند میں ہوتا تو اس کے اندر کوئی شے چپکے سے اسے اس مبہم پیاری سی شکل کی طرف لے جاتی جسے وہ اپنے بازوؤں میں لے کر مسل سکتا تھا اور پھر بھی وہ ان جذبات کو جو اس کے دل میں ایسے لمحات میں پیدا ہوتے، ان لہروں کے ساتھ نہ جوڑ سکتا جو جب کبھی وہ رام چرن کی بہن کو دیکھ لیتا تو اس کے دل میں ابھر آتیں۔

آج رام چرن کی بہن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے ان واقعات کو یاد کیا جن کی طرف بہتے ہوئے اس کے مہمل جذبات زیادہ واضح ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ اسے ایک شراب کی پرانی بوتل میں مٹی کا تیل لانے کے لیے دکانوں کی طرف جاتی ہوئی ملی تھی تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں ایک تعریفی احساس میں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ پھر اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں سے اس کی یاد کی ایک اور تصویر ابھری۔ وہ صبح ہونے سے پہلے کے اندھیرے میں ندی کے کناروں کی طرف سے آئی تھی جہاں وہ جانتا تھا کہ وہ اور نچلی ذات کی دوسری عورتیں رفع حاجت کے لیے جاتی تھیں۔ وہ اس ملگجے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتی تھیں جس میں آدمی انھیں ایسا کرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھی ٹٹیوں کے پاس گھومتا رہا تھا اور اس میں اسے ایک خاص مسرت محسوس ہوا کرتی تھی اور وہ جذبہ اس وقت کتنا طاقتور تھا! اس نے ذہن میں اس کو بالکل ننگا دیکھا جیسا کہ اس نے جب وہ بچہ تھا اپنی ماں کو دیکھا تھا، اور اپنی بہن کو اور دوسرے چھوٹے بچوں کو۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کی مانند ایک جذبہ اس کے ذہن تک

اٹھا اور اس کے خیالوں کو دھندلا کر گیا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ زبردستی اسے اپنی باہوں میں لے سکتا تھا اور جو چاہے اس کے ساتھ کر سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور اس خیال سے خوف کے مارے کانپنے لگا۔ اُس نے ایسا سوچنے پر اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ اس سے اس کی شریف، اچھے اور قابلِ عزت لڑکے ہونے کی شہرت خطرے میں نظر آئی۔ وہ اپنے آپ پر حیران ہوا تھا۔ "میں جسے ہر ایک آدمی نیک باکھا کے طور پر جانتا ہے، یہ ناپاک ارادہ کیسے رکھ سکتا ہوں۔" مگر پھر بھی یہ تصویر اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی۔ جتنی اس نے اسے مٹانے کی کوشش کی اتنی ہی یہ واضح ہوتی گئی حتیٰ کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب اس نے اپنے اِن جذبات انگیز خیالات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تو وہ تصویر غائب ہو گئی۔

اسے یہ باتیں یاد کر کے شرمندگی کا احساس ہوا۔ اسے اس روز بھی جب یہ باتیں پہلے پہل اس کے ذہن میں پیدا ہوئی تھیں، ایسی ہی شرم آئی تھی، اپنے آپ سے فرار ہونے کے لیے اور اس سے پوشیدہ، اس کے دل میں دفن ہوئی خواہش سے بھاگنے کے لیے جو اس کے دل میں اس لڑکی کے لیے تھی۔ وہ اس راستے سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا جو دھوبیوں کے گھروں کو جاتا تھا اور بغیر کسی مقصد کے یونہی گھومتا گھومتا ایک گلی میں گھس گیا جو اسے ندی کے کنارے دھوبیوں کے گھاٹ پر لے گئی۔

"چھی اوچھی اوچھی" کچھ دھوبی ندی کے کنارے پڑے ہوئے پتھروں پر اپنے گاہکوں کے کپڑوں کو پھاڑتے ہوئے اور ان کے بٹنوں کو توڑتے ہوئے چلّا رہے تھے۔ اُن کی سیاہ ٹانگیں پانی کے اندر گھٹنوں تک ڈوبی ہوئی تھیں اور گھٹنوں سے اوپر کمر تک ان کے جسموں پر لنگوٹیوں کی موٹی موٹی تہیں پڑی ہوئی تھیں اور ان میں ان کے کرتے اٹکے ہوئے تھے۔ وہ دوہرے ہو کر پتھروں پر چھُوا چھُو کی سرسراتی ہوئی آواز کے ساتھ کپڑے مارتے تھے۔ یہ آواز سننے میں اچھی لگتی تھی چاہے یہ عمل کپڑوں کے لیے اچھا نہ ہو۔ باکھا نے اِس طرح کھڑے ہو کر اکثر اِس عمل کو دیکھا تھا۔ بچپن میں تو اس کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی اور وہ خود بھی ایک دھوبی بننا چاہتا تھا۔ لیکن رام چرن نے جو اپنی ماں گلابو کا سچا بیٹا تھا، اور اگر اس کا اپنا باپ اس کا باپ نہیں تھا، تو وہ امیر ہندو اس کا باپ تھا جو گلابو کا عاشق تھا، یہ کہہ کر اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا

کہ اگرچہ وہ اس کو چھو لیتا تھا اور اس کے ساتھ کھیلتا تھا مگر وہ ہندو تھا اور باکھا صرف ایک بھنگی تھا۔ باکھا ان دنوں بہت چھوٹا تھا اور وہ رام چرن کے اس مغرور دعوے میں اس امتیاز کو نہ سمجھ سکا ورنہ وہ اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیتا۔ لیکن اب تو وہ جانتا تھا کہ چھوٹی ذاتوں میں بھی درجوں کا فرق تھا اور وہ سب سے نچلے درجے کی ذات کا تھا۔

اس نے بڑے غور سے ان دھوبیوں کو دیکھا جو پتھروں پر کپڑے دھو رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے دھوبیوں کے گدھوں کو دیکھا جو ندی کے کنارے چر رہے تھے۔ وہ ذرا دور کی یہ بات سوچ رہا تھا کہ شاید رام چرن یہاں ہو۔ اس نے اُس خالی اور لمبی جگہ کو دیکھا جہاں دھلے ہوئے گیلے کپڑے دوپہر کے بعد کی تیز دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ لیکن اس کی تلاش بے سود تھی کیونکہ آج کے شبھ دن جب اس کی بہن کی شادی ہو رہی تھی وہ گھر سے غائب ہو کر یہاں کیسے کام کر سکتا تھا۔ "لیکن اپنے باپ کی موت والے دن تو وہ غائب ہو کر کیا ہمارے ساتھ مچھلی پکڑنے نہیں گیا تھا؟" باکھا نے سوچا۔ "وہ شاید آج بھی یہاں ہو۔" اس نے پھر سوچا "شاید اس کا اپنا باپ اس کا باپ نہیں تھا لیکن وہ اپنی بہن کا بھائی تو ہے۔ مجھے تو اس کے گھر پر جانا ہی پڑے گا۔"

وہ واپس ہو لیا۔ اسے شرم آ رہی تھی۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ اس گھر کی طرف کیسے جائے گا جہاں شادی بیاہ کی تقریبات ہو رہی تھیں۔ "دھوبیوں کی ساری برادری وہاں آئی ہوگی، سب نے بہترین کپڑے پہنے ہونگے۔ اور دکن کی طرف کے عجیب وغریب گانے گا رہے ہونگے۔ میں وہاں کیسے کھڑے ہو کر دیکھ سکوں گا۔" اس نے اس سارے منظر کے بارے میں سوچ کر شرم سی محسوس کی۔ آج تو وہ ہر بات کو محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنا جسم ایک عجیب کوڑھ پن کا شکار معلوم دیا اور اندر ہی اندر اس کا جسم کھوکھلا سا ہو رہا تھا۔ "میں وہاں پہنچ کر رام چرن کو کیسے آواز دے سکوں گا؟"

اس کے اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھنے کے درمیانی وقفوں میں اس کے روزمرہ کی معمولی شخصیت لوٹ آئی۔ اس کی گھبراہٹ نیچے کہیں اس کی انتڑیوں کے ڈھیر میں اتر گئی اور اس کے ذہن کی سطح کسی سلیٹ کی طرح صاف ہو گئی۔ وہ ذات بدر

لوگوں کی بستی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا مگر رام چرن کے گھر سے دس گز ادھر ہی اچانک بالکل ساکت ہوکر کھڑا ہو گیا۔ اسے بڑی خوشگوار حیرانی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ چھوٹا لکڑی کے ایک ستون سے لگا کھڑا تھا اور حیرت سے اس ایک کمرے کے کچے مکان میں اور باہر برآمدے میں مردوں اور عورتوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔
باکھا بھی آہستہ آہستہ لکڑی کے ستون کی طرف بڑھا اور چھوٹا کے ساتھ کھڑا ہو گیا اس کے دوست نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا اور بڑے تپاک سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ مگر پھر وہ دونوں اندر موجود بھیڑ کی طرف جو بڑی خوش تھی اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی، دیکھنے لگے۔ باکھا نے دیکھا کہ سب دھوبیوں نے کلف لگے کپڑے پہنے ہوئے تھے جوان کے کالے جسموں پر بڑے سفید لگ رہے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ اپنی نظر ہر آدمی پر الگ الگ نہیں رکھ سکا۔ اسے اپنی نظریں برآمدے سے پرے اٹھا کر اس چھوٹے سے کمرے تک جس میں مدھم سی سورج کی روشنی تھی لے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے سر کے پیچھے ایک خوشگوار گرمی نیچے تک اتر رہی تھی۔ کم روشنی میں سے اسے ایک آدمی اس کی طرف گھورتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی ذات کے احساس سے کانپ سا گیا۔ رام چرن کی بہن کا تصور اس کی حقیقی تصویر سے ٹکرا گیا۔ اس کا دل ڈوبنے سا لگا۔ اسے پسینہ آرہا تھا۔ اس کی خوش قسمتی سے اس وقت ڈھول پر تھاپ اور زور سے پڑی اور اس شور نے باکھا کے دل کی گھبراہٹ کو دور کر دیا۔ وہ اس گیت میں کھو گیا جو اس تھاپ پر گایا جا رہا تھا۔ یہ ایک عجیب گیت تھا جو بجلی کی کڑک کی مانند اچانک اٹھتا تھا اور جیسے نیچے کے تین سروں میں ساری بھیڑ مل کر گا رہی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ گیت ایک رونے دھونے کی چیخ سا لگا جو کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی دماغ میں گھس گئی اور جو ہر سننے والے کو اپنے تیز سے تیز تر جنون سے پاگل بنا رہی تھی۔ جیسے کہ بجلی اپنے تیز طاقتور پنجوں سے دل کو چیر دیتی ہے اور اسے تیزی سے دھڑکتا چھوڑ دیتی ہے۔ ابھی وہ بہت آگے نہیں بڑھے تھے کہ گیت ڈھول کی صدا سے بھی اوپر اٹھ گیا اور اس نے اپنے آہنگ اور تاثر کو دیر تک قائم کر دیا۔ باکھا اس گیت پر ایسے جھومنے لگا جیسے کسی جھولے پر جھول رہا ہو۔ اور جونہی گیت اپنے انتہائی شوریدہ نقطے پر پہنچ گیا اور دھوبیوں اور دھوبنوں کے لہراتے جھومتے، چیختے چلاتے اور رقص

کرتے جسموں نے اس کے اثر کو اور بڑھا دیا تو باکھا پھر اپنی ذات کے احساس سے ٹھنڈا اور سست سا پڑ گیا۔ اس نے گھبرا کر چھوٹا کا بازو چھوا اور اس کی یہ حرکت طوفان بپا کرتے ہوئے دھوبیوں کے گانے اور رقص کے شور و غل میں کسی نے دیکھی بھی نہیں۔ چھوٹا نے بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اس مسکراہٹ میں اتنا ہی پیار تھا جتنا اس خوشی کے ماحول میں آسکتا تھا۔

"میں رام چرن کو آواز دیتا ہوں" چھوٹا بولا اور اس گاتے ہوئے دھوبیوں کی بھیڑ سے وہ نہ شرمایا اور نہ ڈرا اور اس نے رام چرن کو آواز دے دی۔ رام چرن مشرقی اور مغربی طرز کے متضاد کپڑوں کی ایک عجیب و غریب آمیزش میں ملبوس تھا۔ اس کے چھوٹے سے سر پر ایک خاکی ٹوپی، ململ کا کرتہ، بالکل صاف اور سفید مگر کالر کے پاس سے پھٹا ہوا اور اس کی پتلی اور ننگی ٹانگوں میں نیکر۔

پہلے تو رام چرن لڈو کھانے میں اتنا مشغول تھا جو اس کی ماں برتنوں میں دیسی شراب لیے بانٹ رہی تھی کہ اسے اپنے دوست کا پیغام جسے اس کے پاس بیٹھے ہوئے کس آدمی کے ذریعے لوگوں کے سروں کے اوپر سے پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی، ملنا مشکل تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اچانک خود ہی کھڑا ہو گیا اور اس نے بھیڑ پر ایک ٹوٹے ہوئے کنستر میں سے کاٹی ہوئی پچکاری سے رسم کے مطابق لوگوں کے سفید کپڑوں پر سرخ رنگ چھڑکا اور چھڑکتا گیا۔ رنگ پڑی بھیڑ نے جوش و خروش سے اسے سروں پر اٹھا لیا اور چیختے چلاتے اور گلا پھاڑتے ہوئے اسے باہر پھینک دیا!

"آؤ یار" اس نے چھوٹا اور باکھا کا استقبال کیا اور اپنی بے پلکوں کی آنکھوں کو جھکاتا ہوا آگے دوڑ گیا۔

"ابے سالے ہمیں بھی تو تھوڑی سی مٹھائی کھلا" چھوٹا بولا

رام چرن اپنے نیکر کی جیبوں میں، ایک بڑے ریشمی رومال میں رکھ کر جو اس نے ایک امیر آدمی کی دھلائی میں سے نکال لیا تھا، لڈو بھرنا نہیں بھولا تھا۔

"تھوڑی دیر دونوں چپ رہو" رام چرن نے یہ کہتے ہوئے مڑ کر دیکھا کہ کہیں اس کی ماں تو نہیں دیکھ رہی تھی کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔

مگر وہ دیکھ رہی تھی!

"او حرام کی اولاد" اس کی ماں کی سخت آواز دوسری تمام آوازوں اور شور سے اوپر اٹھ کر آئی۔ "کیا تو آج اپنی بہن کی شادی کے دن بھی اِس گندے بھنگی اور چمار کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھاگ رہا ہے؟ او کتّے کے پلّے شرم کر۔"

"کتیا اپنا منہ بند کر" رام چرن نے چلّا کر جواب دیا جیسا کہ اس کے بولنے کا طریقہ تھا۔ اپنی ماں کی چوبیس گھنٹے کی گالی گفتار نے اسے پرلے درجے کا گستاخ، ضدی اور شیطان بنا دیا تھا اور وہ اس تنگ راستے پر ہولیا جو نیچے سے ہوتا ہوا بھنگیوں کی بستی کے شمال کی طرف جاتا تھا اور اس کے بالکل پیچھے چھوٹا اور تھوڑی دور پر باکھا تھا جو بڑے بھدے طریقے سے چل رہا تھا۔

"سالے تھوڑے سے لڈّو ہمیں دے دے" لالچی اور خوش و خرم چھوٹا زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں نے تیرے غل غپاڑے اور شور والے گھر کے آگے ایک گھنٹہ انتظار کی ہے۔"

"پہاڑی پر پہنچتے ہی تم دونوں کو ضرور لڈّو ملیں گے۔" رام چرن نے تسلی دی "میں انھیں تیرے اور باکھا کے لیے ہی لایا ہوں، اور کسی کے لیے نہیں۔ آؤ ذرا دوڑ کر چلیں کہیں اماں بھاگتی ہوئی پیچھے نہ آجائے۔" اور وہ اس آدمی کی طرح لگ رہا تھا جسے اچانک کوئی طاقت مل گئی ہو۔ باکھا نے نہیں تو چھوٹا نے اس کی تعریف کی اور رام چرن اس کو اپنا حق سمجھ رہا تھا کیونکہ اس کے قبضے میں ایک درجن لڈّو تھے۔

"او ہاتھی چل بھی" اس نے باکھا کو اس کی سست رفتاری پر جھڑکتے ہوئے کہا "ابے ذرا ہنس اور اپنی ٹانگیں اٹھا۔ تجھے جلدی مٹھائی ملے گی۔"

باکھا نے اس کے مذاق کے کھردرے پن کی کوئی پرواہ نہیں کی اور چپ چاپ چلتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو اس انسانوں کی دنیا سے بڑا کٹا ہوا محسوس کر رہا تھا اور ایک قسم کی گہری اداسی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ قدرت اپنا حسین ہاتھ اس کی طرف بڑھا رہی تھی کیونکہ بلا شاہ کی پہاڑیوں کی انترائیوں پر لمبی لمبی گھاس نظر آرہی تھی اور اس کے سینے اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایک ٹھنڈی ہوا اسے اس بھیڑ بھڑکے سے اور نچلی ذات کی بستی کی غلاظت اور شور سے، آہستہ قدمی سے دور لیے جارہی تھی اور اس کے دل میں ایک اچانک مسرت موجزن تھی۔ اس نے اپنے سامنے لہراتی ہوئی مسرت آگئیں

گھاس کو دیکھا اور پھر ان چھوٹی پہاڑیوں کو جن پر وہ دھوپ بھرے آسمان کے نیچے پھیلی ہوئی تھی۔ اور آسمان اتنا نیلا اور حسین تھا کہ اس نے سوچا کہ اس کے سامنے گونگا اور بے حس و حرکت بن کر کھڑا ہو جائے۔ اس نے جھاڑیوں کی معصوم سی سیٹیاں سنیں۔ یہ وہ صدائیں تھیں جن سے وہ بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ اسے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے دوست اس کے آگے تھے اور یہ سکون اِسی طرح قائم تھا۔ اس کی روح اِس وقت اونچائی پر جھکی ہوئی تھی اور وہ سکوت اور تنہائی میں قدرت سے ہم آہنگ ہونا چاہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر اسے ایک بھی انسانی آواز سنائی دی تو وہ بڑا ناخوش ہو جائے گا۔ اس کے اندر کی گہرائی تک اس بات سے واقف تھی کہ اس کا دل خوش نہیں ہوگا اگر اس کے اور باہر کی قدرت کے درمیان کوئی رکاوٹ پیش آئی۔ اس کو یہ کبھی نہیں سوجھا کہ وہ اپنے آپ سے پوچھ لے کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ وہ تو اپنے سامنے دور تک پھیلے ہوئے شاندار کھیتوں کی پتلی سے پتلی جھالر سے ہی خود رفتہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے آپ کو نباتاتی دنیا کے حقیر آمیز مزاجوں کی آگاہی سے دوچار پایا۔

آگے بڑھتے بڑھتے باکھا کو محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنی قدرت پسندی کی اس تنہا سیر و سیاحت کو انسانیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے تو اسے کسی نہ کسی کی دوستی کا دم بھرنا پڑے گا۔ لیکن وہ رام چرن اور چھوٹا کو اپنے پاس بلا کر اپنی مسرت کو ان سے بانٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کئی کارہائے نمایاں یاد کیے جو اس نے اپنے بچپن میں کیے تھے اپنے ابتدائی ایام میں اس وقت کو یاد کیا جب وہ دیہات کی طرف اپنے دوسرے تمام دوستوں کے ساتھ آیا کرتا تھا اور وہ سب پہاڑی کی چوٹی پر ایک خیالی قلعہ تعمیر کر لیتے تھے اور اس کے لیے لڑائیاں کرتے تھے۔ وہ بانس کی کمانیں بناتے تھے جن سے وہ ایک دوسرے پر تیر چھوڑتے تھے اور وہ کھلونا طمنچوں سے بھی جن میں سے ایک چنگاری سی نکلتی تھی ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ وہ سب کچھ اسے یاد آ رہا تھا۔ اس وقت اس کے سارے دوست اس پر فخر کرتے تھے اور اسے دیکھتے ہی جوش سے بھر جاتے تھے۔ انھوں نے اسے اپنا جرنیل بنا لیا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اس لڑائی کو یاد کیا جو انھوں نے ۳۸ ڈوگرہ رجمنٹ کے لڑکوں سے لڑی تھی اور جس میں وہ فتح یاب لوٹے تھے۔ کچھ لڑائیاں اتنی دلچسپ

اِدھر اُدھر بھی ہوئی تھیں، اس طرح نہیں جیسے رجمنٹوں کی لڑائیاں یا فوجوں کی مشق بڑی تنظیم سے بندوقوں کے ساتھ کی جاتی تھی بلکہ بچوں کے درمیان جیسے ہوتی ہیں۔ "لیکن اُس وقت" اس نے اپنے آپ سے کہا "وہ تو ہمارے بچپن کے کھیل ہوتے تھے۔ وہ کھیل اب میں کہاں کھیلوں گا۔ اب میرے پاس ہاکی تک کھیلنے کے لیے وقت نہیں ہے اور میرا باپ ہر وقت مجھ پر چلّاتا رہتا ہے۔" یہ باتیں سوچ کر اسے کچھ اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اس لیے اس نے اپنا ذہن دوبارہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو کھوجنے میں لگا دیا مگر اسی مہمل بھٹکنے والے طریقے سے جس کا اس کا ذہن کچھ بھی معلوم کرنے کے لیے عادی تھا۔ پہاڑی کی اترائیوں پر جن پر گھاس کا غالیچہ بچھا تھا طرح طرح کے پھولوں کی بہتات تھی جن کے رنگ وقفے وقفے کے بعد بدل جاتے تھے۔ زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے لمبوترے پھول تھے جو باکھا کو ہمیشہ سیالکوٹ کے نزدیک اپنے گاؤں کے سرسوں کے پھول نظر آتے تھے۔ اسی طرح کچھ سدابہار، کچھ جامنی اور سفید رنگ کے پھول جگہ جگہ اگے ہوئے تھے اور باکھا کے لیے تو وہ سب پھول تھے صرف پھول کیونکہ اس کو ان کے نام بھی نہیں آتے تھے۔ لمبی گھاس اور دُوب میں ایک چھوٹا سا پانی کا تالاب تھا جیسے کوئی بڑا گول حوض ہو جس کے کناروں پر چاندی کے رنگ کی روپہلی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے جھولتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی پی رہی ہیں۔ یہاں پر راہ گیر اس پانی سے اپنی پیاس بجھاتا تھا جو ایک قدرتی چشمے سے نکل رہا تھا۔

نیچے اتر کر وہ اس کے پاس پہنچا۔ اس کے نتھنے تازہ ہوا سے بھرے ہوئے تھے اور اس کا دل اتنا ہلکا تھا جیسے چڑیوں کا جوش و خروش ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں پہنچ کر باکھا کا احساس بیدار نہیں ہوا اور نہ اس میں کوئی خاص جوش بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی بچے کی مانند تھا جو راستے میں اگے ہوئے پھولوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اس آدمی کی طرح جذبۂ قبولیت اور آمادگی تھی جو ہر نئے تجربے کا لطف اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کے دل میں وہ بیداری نہیں تھی۔ ضرورت نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ قدرت کے نظاروں کے بارے میں سوچے، لیکن صرف سرسری طور پر۔ وہ اس نسل کا تھا کہ اس کی روح میں کوئی ایسی

گہری کیاریاں نہیں تھیں جن میں کوئی پھول اگ سکیں یا گھاس کی بہتات ہو۔ محتاط انتخاب کے تہہ در تہہ اثر نے اس کے آزاد دل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا اور وہ صرف ایک ہی پیشے کے خشک ماحول اور روزمرہ کی یکسانیت میں محدود ہو چکا تھا۔ اب جو محدود اور تنگ شخصیت اسے ورثے میں ملی تھی اس سے باہر آنا اور کسی بڑی بات کی آرزو کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اس کی ذات اور حالات میں جھگڑا تھا جس کی وجہ سے اس جیسا شیر جال میں پھنسا پڑا تھا جب کے بہت سے عام مجرم راجہ کا تاج پہنے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے نامحسوس تجربے کی دولت غیر معمولی تھی۔ یہ ایک قسم کا دنیا کو اپنے کھردرے احساس سے جان لینے کے مترادف تھا۔ کوئی کسان اپنا کام آسانی سے کر لیتا ہے اور کسی تجربے گاہ پر کام کرنے والا کھیتی باڑی کا ماہر اپنا سر ہی کھجلاتا رہتا ہے اور یا کوئی عربی ملاّح جو سمندروں پر اپنی چھوٹی کشتی چلاتا ہے صرف سورج کو دیکھتے ہی اپنی سمت مقرر کر لیتا ہے یا وہ گانے والا فقیر جو ہر دروازے پر کوئی پرانی کتھا سنا دیتا ہے۔ لیکن اس کے مہمل احساس کو کسی حقیقی معنوں میں تہذیب یافتہ آدمی کے جذبے میں بدلنے کے لیے سخت قوتِ ارادی اور طاقت ور سوچ کی ضرورت تھی۔

تیز تیز آگے بڑھتے ہوئے، اچانک اس کے ذہن میں ایک کوندہ لپکا اور اس کو ایک شدید خواہش نے جکڑ لیا کہ وہ گمنامی اور خاموشی کے اس سایے میں سے جس میں وہ گھرا ہوا تھا زبردستی باہر نکل آئے گا۔

وہ نشیب پر سے تیزی سے اترا اور اپنے دوستوں کے پاس پہنچ گیا جو تالاب کے کنارے کھڑے تھے۔ ٹھنڈی ہوا اس کے کانوں میں سرسراتی ہوئی چل رہی تھی اور اس کا خون اس کی نرم تازہ ٹھنڈک میں متحرک سا ہو گیا۔ اس کے سامنے افق میں سورج کا عکس نیچے پانی کی لہروں میں اسی بے چینی سے پڑ رہا تھا جو باکھا کے دل کے درد میں تھی۔ وہ سبزہ گاہوں میں سے ہوتا ہوا جہاں ہریالی تھی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ کھلی فضا میں پورا سانس لے سکتا تھا۔ وہ تالاب کے کنارے لیٹ گیا اور فوراً ہی اپنے گرد پھیلے ہوئے سکوت میں ڈوب گیا۔ اس نے ذرا سی بھی حرکت نہیں کی حالانکہ جس طریقے سے وہ پیچھے کو جھکا ہوا تھا اس سے اس کی آنکھوں میں

سورج کی چمک پڑ رہی تھی۔ ایک یا دو لمحوں میں اس کا وجود ایک ایسی نا اہمیت میں ڈوب گیا جیسے گہرے سکوت کے کسی گڑھے میں دفن ہو گیا ہو جب کہ دھوپ میں نہائے ہوئے کنارے پر پڑی ہوئی اشیا بھی زندگی پانے لگیں۔ پودوں میں پتے پھوٹنے لگے، واضح اور اہم۔ اسے ساری وادی زندگی سے چمکتی ہوئی نظر آئی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اوپر کی قیمتی اور جاندار خلاؤں نے اس کی تمام قوت چوس لی تھی۔ وہ مردے کی طرح بے حس پڑا تھا۔ خالی پیٹ نے اس کے اندر نیند کی خواہش کو ابھار دیا تھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔

وہ مشکل سے ہی سویا ہوگا کہ چھوٹا آیا اور اس نے اس کی ناک کو ایک تنکے سے گدگدانا شروع کر دیا۔ بھنگی کا لڑکا ایک زبردست چھینک مار کر اٹھ گیا اور اپنے جسم کو سیدھا کر کے بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے اس کے دوست بری طرح قہقہہ مار رہے تھے۔ باکھا کوئی چڑچڑا لڑکا نہیں تھا جو اپنے دوستوں کے اس چھوٹے سے عملی مذاق پر ناراض ہو جاتا اور وہ خوشی سے ان کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا۔ لیکن صبح کے واقعات نے اس کے دل پر اوس ڈال دی تھی اور اگرچہ اس کے دوست کھلکھلا کر ہنس رہے تھے، اس کی ہنسی میں ایک زبردستی، ایک مجبوری جھلک رہی تھی۔ چھوٹا نے اسے محسوس کر لیا اور اس نے دیکھا کہ کوئی نہ کوئی تناؤ کی بات ہے اور کسی نہ کسی بات سے یہ ظاہر تھا کہ باکھا کو وہ مذاق جو انھوں نے کیا تھا پسند نہیں تھا۔

"ابے سالے کیا ہو گیا تجھے؟" اس نے پوچھا

"کچھ نہیں" باکھا نے جواب دیا۔ "تم دونوں دوڑ رہے تھے، میں آہستہ آہستہ آگیا"

"تو نے ہمیں ڈھونڈا کیوں نہیں؟"

"میں تھک گیا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ کل رات مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی تھی"

"کیونکہ تو ایک جنٹلمین ہے اور اپنے باپ کی طرح رات کو رضائی اوڑھ کر سونا نہیں چاہتا" چھوٹا نے مذاق کیا۔ اسے راکھا وہ سب کچھ بتا دیتا تھا جو باکھا کے ساتھ گھر پر ہوتا تھا اور جو گالیاں باپ اس کو دیتا تھا اور چھوٹا باکھا کو چھیڑا کرتا تھا۔

"بند کر" باکھا مذاقاً چلّایا "تو میرے سے زیادہ جنٹر مین ہے اور اپنے اِس سالے کو تو دیکھ لے آج صاحب لوگوں کی ٹوپی اور نیکر پہنے ہوئے ہے۔"

اگرچہ وہ سب انگریزی رواجوں کی نقل کرنے کے خواہش مند تھے لیکن اندر ہی اندر انھیں تھوڑا سا تو یہ احساس تھا کہ یہ سب غلط تھا اور انھیں اپنے بڑوں کے طنز بھرے جملوں کا تیکھا پن بھی سہنا پڑتا تھا۔ "اس جنٹر مین کو دیکھو!" اور وہ اِسے آپس میں دہراتے بھی تھے۔

"اُن لڈوؤں کا کیا ہوا؟" باکھا نے رام چرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے لڈو کھانے کی کوئی اتنی خواہش تو نہیں تھی لیکن ایک کھانے کو مل جاتا تو ٹھیک تھا۔

"تیرا حصّہ یہ رہا" رام چرن نے ساتھ لائے ہوئے رومال کو کھولتے ہوئے کہا۔

اِس کے اندر تین لڈو تھے، جو ذرا ذرا ٹوٹے ہوئے تھے۔

"میری طرف ایک پھینک دے" باکھا بولا

"لے پکڑ" رام چرن نے کہا

باکھا ہچکچایا اور اس نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

"ابے لے نا! اب پکڑتا کیوں نہیں؟" رام چرن نے شکایتی لہجے میں بولا

"نہیں تو مجھے دے دے، میری طرف پھینک دے۔" باکھا نے کہا

رام چرن اور چھوٹا دونوں حیران تھے۔ انھوں نے باکھا کو کبھی ایسا سلوک کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ رام چرن چونکہ دھوبی تھا، اسے ان میں اونچی ذات کا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد چھوٹا کا نمبر آتا تھا کیونکہ وہ چمار کا لڑکا تھا اور باکھا تیسرے اور سب سے نچلے درجے کا تھا۔ لیکن ان تینوں میں آپس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز اور بھید بھاؤ نہیں تھا، سوائے ان موقعوں کے جب کوئی شان جتانے یا مذاق کرنے کے لیے اونچی یا نیچی ذات کو بنیاد بنانا ضروری تھا۔ اگر رسے دار چیزیں نہیں جن میں پانی پڑتا تھا تو خشک چیزیں تو وہ اکٹھی کھاتے ہی تھے اور ایسا وہ ہندوؤں

کی نقل میں کرتے تھے جن کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایک سا ہی برتاؤ تھا۔ انھوں نے اکثر مٹھائیاں اکٹھے کھائی تھیں اور انھوں نے سوڈا واٹر کی بوتلیں بھی پی تھیں، اُن تمام ہاکی کے میچوں میں جو وہ سال میں ایک دفعہ بلا شاہ بریگیڈ کی مختلف رجمنٹوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔

"تجھے آج ہو کیا گیا ہے ؟" چھوٹا نے بڑا فکر مند ہو کر پوچھا اور پھر اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "تو ہمارا دوست ہے، ہمیں تو بتا دے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں ہے۔" باکھا نے کہا

"ارے بتا بھی دے۔ دیکھ ہم سب دوست ہیں۔" چھوٹا نے نرمی سے کہا

باکھا نے انھیں بتایا کہ کس طرح جب صبح انھیں چھوڑ کر وہ شہر جا رہا تھا تو ایک آدمی اسے چھوتا ہوا آگے نکل گیا اور اس نے اسے کیسی کیسی گالیاں دیں اور بھیڑ اکٹھی کر لی اور کس طرح اس کے نکل بھاگنے سے پہلے اس آدمی نے اسے تھپڑ مارا۔

"تُو نے بھی اس کے تھپڑ کیوں نہیں مارا ؟" چھوٹا آگ بگولہ ہو کر بولا

"صرف یہی بات نہیں ہوئی" باکھا بولتا رہا۔ اس نے وہ ساری بات سنائی کہ کس طرح پجاری نے اس کی بہن کی عزت لوٹنے کی کوشش کی اور پھر ان دونوں پر چلّاتا ہوا باہر آیا کہ "میں بھرشٹ ہو گیا، میں بھرشٹ ہو گیا۔"

"تو ٹھہر۔ وہ حرامزادہ کبھی ہماری بستی کی طرف آیا تو ہم اس کی کھال ادھیڑ دیں گے۔" چھوٹا طیش میں آ کر بولا

"آگے چل کر میری بے عزتی ایک دفعہ پھر ہوئی۔" باکھا پھر بولا اور اس نے وہ قصہ بھی سنا دیا کہ کس طرح چاندی کے سناروں کی گلی میں ایک عورت نے اپنے مکان کی اوپر کی منزل سے اس پر روٹی پھینکی تھی۔

"کامریڈ ہمیں بڑا افسوس ہے" چھوٹا نے کہا "اب جو ہوا اسے بھول جا اور بہادر بن۔ ہم کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔ ہم ذات سے باہر ہیں۔" اس نے باکھا کو تسلی دیتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "چل" اس نے پھر اس کی ہمت بڑھائی، "سب کچھ بھول جا۔ ہم چل کر ہاکی کھیلتے ہیں۔ اس سالے پنڈت کو ہماری طرف آنے دے، اسے وہ سبق سکھائیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

"چل چلیں" رام چرن بولا جو باکھا کی کہانی سن کر بڑا برا محسوس کر رہا تھا اور ساتھ ہی اب زیادہ ڈر رہا تھا کہ اگر وہ گھر سے زیادہ دیر غائب رہا تو ماں اسے خوب کوسے گی۔ "مجھے دوبارہ آنے اور ہاکی کھیلنے کے لیے ایک دفعہ تو شکل دکھانی ہی پڑے گی" اس نے پہلے چھوٹا اور پھر باکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آجا" چھوٹا نے پیار سے باکھا سے کہا۔ اس کی آواز میں بڑی اداسی تھی۔

باکھا کھڑا ہو گیا اور وہ تینوں چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

رام چرن کو یہ خاموشی بڑی بری لگ رہی تھی، اتنی بری کہ اس نے سوچا کہ یہ موقع سولہ ہیٹ پہن کر اپنا بڑا پن جتانے کا نہیں ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے سر پر سے یہ غیر آرامدہ عجیب و غریب بڑا ٹوپ اتار لیا اور کڑھتا ہوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

باکھا کی روح اب اپنے دوستوں کے سامنے ننگی نظر آتی تھی، کمزور اور زخمی۔ چھوٹا کی اس کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور اس نے باکھا کی اداسی کا ساتھ دیا۔

باکھا کو اپنا قصہ دہرا کر دوستوں کی جو ہمدردی ملی اس نے باکھا کے زخموں کو اور گہرا کر دیا۔ چلتے چلتے وہ آج صبح لگے ہوئے کچوکوں کی جلن کو زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگا۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور اس کا غصہ اس ظاہرہ طاقت سے اور بڑھ گیا جو اسے دو دوستوں کی موجودگی عطا کر رہی تھی۔ "چھوٹا اور میں اس بداخلاق بنڈٹ کو سبق سکھا سکتے تھے" اس نے سوچا۔

"تیرا کیا خیال ہے آج ہی اس سور کو پکڑ لیں؟" چھوٹا بولا

باکھا نے سوچا کہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اور چھوٹا ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ لیکن وہ اس کے سجھاؤ کو ماننے کے لیے اپنے اندر ہمت نہیں پاتا تھا اور وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو کمزور پاتا تھا۔

"کیا فائدہ" باکھا نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن وہ کھلے طور پر بدلہ لینے کی خواہش سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ پھر اداس ہو کر سوچ میں ڈوب گیا کہ وہ اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے ناقابل تھا۔ اس نے پکا ارادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو سخت بنائے گا۔ اس نے اپنے دانت پیسے۔ اس کے کانوں تک ایک گرمی پہنچی۔

اس کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ پھر اس کے دل میں بار بار پیدا ہونے والے جذبات کا ایک ریلہ سا آگیا۔ وہ غصے میں بھننے لگا۔ "کتنا ڈراؤنا، کتنا خوفناک!" اس کی روح اس کے اندر چیختی ہوئی لگی۔ اس نے اپنے جسم میں اس سے پہلے اتنی ذہنی تکلیف کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ وہ کانپنے لگا۔ اس کا چوڑا، جذبات سے عاری چہرہ دشمنی کے احساس سے زرد ہوگیا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور سکڑی ہوئی چھاتی سے آگے بڑھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا جسم ایک ناقابلِ بیان اور مجتمع قوت کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے قد کو اس طرح جھک کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کہ اسے یہ بھی خوف ہو کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

"وہ سالا رام چرن کہاں ہے؟" چھوٹا نے تناؤ کو کم کرنے کے لیے کہا
"شاید کھمبیاں دیکھ رہا ہوگا۔" باکھا نے مذاق کیا۔ اس سے اس کی تنی ہوئی بھویں کچھ جھکیں اور اس کی پیشانی کی شکنیں ہموار ہوگئیں۔

اس میں دبی ہوئی سرکشی کی جگہ ایک آسان قدرتی احساس نے لے لی۔ وہ بلا شاہ کے شہر کے پہاڑی کے دامن میں سہ پہر کی خاموشی میں آرام سے سوتے ہوئے منظر میں کھو یا گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے لے کر جو دور شمالی دروازے کے پرے سے لے کر، مغرب میں پھیلی چھاؤں تک نظر آرہے تھے اور مشرق میں آموں کے باغات سے نچلی ذات کے لوگوں کی بستی کے گھروں تک سفید نیلگوں نیچے تک لٹکے ہوئے آسمان میں، مندروں کے سنہرے کلس، گھروں کی چپٹی چھتیں، ورمڑی ہوئی منڈیریں جن پر نیلے رنگ کے گملے رکھے ہوئے تھے، ماحول میں طرح طرح کے نقش و نگار بنا رہے تھے۔ پھر اس کے سامنے دلدلوں اور نشیب میں اس کے گھر کی پھوس دار چھت ابھر آئی۔ یہ اس کے گرد و پیش اُگے ہوئے پھول اور پتّوں، آموں کے ہرے ہرے باغات اور اس کے گھر کی آس پاس کی دلدل اور گندی زمین میں کتنا زبردست تضاد تھا۔

"میرا خیال ہے میں بھی ہاکی کھیلنے کے لیے آنے سے پہلے اپنی شکل ایک دفعہ گھر دکھا آتا ہوں۔" چھوٹا نے اچانک کہا "ابھی تک بہت دھوپ ہے۔"

"ٹھیک ہے،" مجھے بھی حوالدار چیرت سنگھ نے کہا تھا کہ اگر میں دوپہر کے بعد اس کے پاس آیا تو وہ مجھے ایک ہاکی دے گا۔" باکھا بولا "میں بھی جاکر ہاکی لے آتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے تو جاکر ہاکی لے آ۔" چھوٹا مان گیا۔"میں اور رام چرن تیرے پاس میچ شروع ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ ہم اس پگڈنڈی سے چلے جاتے ہیں۔"

وہ اس وقت ایک چھوٹی گلی پر پہنچ گئے تھے جس کے کنارے جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور جو نچلی ذات کے لوگوں کی بستی کی طرف جاتی تھی۔ یہاں سے وہ الگ الگ ہو گئے۔

باکھا کھلے میدان میں تیز تیز، پتھروں میں سے ہوتا ہوا، آگے بڑھ گیا۔ یہ کھلی جگہ دراصل کبھی ندی کا راستہ تھا جو پہاڑیوں اور ۳۸ ڈوگرا رجمنٹ کی بارکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ چیرت سنگھ سے کام کی یہ بات تو اس نے صرف اس لیے سوچ لی تھی کیونکہ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ بھائی اور بہن کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جاکر ٹٹیوں پر کام کرنا نہیں چاہتا تھا، کم سے کم آج تو نہیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنے قصور کا احساس ہوا کہ وہ اپنے کام سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ تو اپنے ماحول سے اوپر اٹھ چکا تھا اور وہ تو اپنے کچے گھر کے آس پاس بھی جانے کے تصور سے ہی نفرت کرنے لگتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کا کوئی چھوٹا سا حصّہ اسے یہ کہتا تھا کہ وہ کبھی اپنے ماحول سے باہر نہیں آسکے گا۔ مگر اس کے زیادہ تر وجود کے لیے تو وہ جگہ تھی ہی نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی بستی کے نقشے پر سے وہ صاف مٹا دی گئی تھی۔

بارکوں کے احاطے میں کوئی بھی تو آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ کوارٹر گارڈ بھی خالی اور اجاڑ نظر آرہا تھا، سوائے دو بدھوے سنتریوں کے جو اسلحہ خانے کے باہر برآمدے میں اوپر نیچے چل رہے تھے۔ باکھا جانتا تھا کہ اسلحہ خانہ تالہ پڑے ہوئے دروازوں کے عقب میں تھا۔ وہاں باکھا کو صرف ایک سولہ ہیٹ جو دیوار پر ٹنگا ہوا تھا، بڑا جیتا جاگتا اور متحرک نظر آیا۔ اس ٹوپ کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔

کچھ کہتے تھے کہ یہ گوروں کے امتیاز کی نشانی تھی جو رجمنٹ پر حکومت کرتے تھے۔ دوسرے کہتے تھے کہ اسے اس رجمنٹ کے دفتر میں کوئی صاحب بھول گیا تھا اور چونکہ وہ صاحب تھا اس نے اپنے کھوئے ہوئے ہیٹ کو حاصل کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ جب سے یہ کوارٹر گارڈ میں ہی رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی افواہ اڑی تھی کہ ایک صاحب کا کسی سپاہی کو گولی مارنے پر کورٹ مارشل ہوا تھا اور چونکہ وہ گورا تھا اور اسے کوارٹر گارڈ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا' اس کی بجائے اس کے ہیٹ' پیٹی اور تلوار کو قید میں رکھا گیا۔ وہ صاحب اچانک غائب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ رجمنٹ کے آفیسر کمانڈنگ نے راتوں رات بھاگنے میں اس کی پوری مدد کی تھی تاکہ وہ جیل کی سزا سے جو ججوں نے سنا دی تھی بچ نکلے۔ صرف اس کا ہیٹ کوارٹر گارڈ میں رہ گیا تھا۔ اِس کے برعکس اگر سنتریوں سے پوچھا جائے کہ یہ ہیٹ کس کا ہے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیں گے کہ یہ ایک صاحب کا ہے جو رجمنٹ کے میدان میں گیا ہے اور اسے لینے کے لیے آنے ہی والا ہے! لیکن کسی نے اِس ہیٹ کے بارے میں سوال نہیں پوچھے سوائے ۳۱ ڈوگرہ رجمنٹ کے بچوں کے۔ اُن میں سے زیادہ تر چھوٹے بچے تھے جو' جو کچھ سنتری کہتے تھے اسے مان لیتے تھے اور بھاگ جاتے تھے کیونکہ صاحب لوگوں سے بڑا ڈر لگتا تھا جیسے کہ زردی مائل سفید رنگ کے بھوتوں' جنوں اور چڑیلوں سے ڈر لگتا ہے کیونکہ اِن صاحب لوگوں کے بارے میں یہ افواہ تھی کہ وہ بڑی جلدی غصّہ ہو جاتے تھے اور اگر کوئی انھیں دیکھ لیتا تھا تو وہ اپنی چھڑی سے اسے مارتے تھے۔ بڑے لڑکے جانتے تھے کہ یہ سب جھوٹ تھا جو سنتریوں نے متجسّس چھوٹے بچوں کو بھگانے کے لیے گھڑ رکھا تھا۔ انھیں یہ بھی یاد تھا کہ وہ برسوں سے اِس ہیٹ کو اِسی جگہ پر دیکھ رہے تھے اور ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ جب کبھی انھوں نے اسے دیکھا تو اُسی وقت کوئی صاحب اسے وہاں رکھ گیا ہو!

لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ انھیں بھی اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ سنتریوں نے یہ جھوٹ کیوں ایجاد کیا تھا۔ انھیں یہ نہیں پتہ تھا کہ سپاہی بھی اس ہیٹ کو لینا چاہتے تھے اس لیے نہیں کہ وہ اپنی وردی اور سادہ کپڑوں کے ساتھ اِس ہیٹ کو

پہن سکتے تھے بلکہ اِس لیے کہ پہاڑوں میں ان کے گھر والوں کے لیے یہ ایک عجوبہ تھا اور سارے گاؤں والے اسے حیرت سے دیکھیں گے۔ لوگ اسے میلوں دور سے تحیّر بھری آنکھوں اور تعریفی نگاہوں سے دیکھنے آئیں گے جیسے وہ ان کی فوجی وردی اور سفید کپڑے دیکھنے آتے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اپنے گھر کانگڑہ یا ہوشیارپور جاتے ہوئے کتنا فخر محسوس کریں گے کہ وہ اپنے سامان میں صاحب لوگوں کی یہ علامت بھی لے جارہے ہیں۔

مگر سولہ ہیٹ کے بارے میں یہ سب کہانیاں پھیلی کیوں تھیں؟ اس وجہ سے کہ ۳۸ ڈوگرا رجمنٹ کے آس پاس کوئی بھی بچہ ایسا نہیں تھا جس نے اپنی متجسّس نگاہیں اس پر نہ ڈالی ہوں۔ رجمنٹ کے نوجوانوں کو جدید فیشن کی کشش نے پاگل سا بنا دیا تھا۔ ہر لڑکے کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ مغربی لباس پہنے اور چونکہ اس جگہ رہنے والے زیادہ تر بچے بابوؤں، بینڈ والوں، سپاہیوں، بھنگیوں اور دکانداروں کے بیٹے تھے جو سب اتنے غریب تھے کہ ایک پورا یوروپین لباس خریدنے کی عیاشی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بچے اس موقعے کی تلاش میں رہتے تھے کہ ہاتھ پھیلا کر کسی سے کوئی ولایتی چیز مانگ لیں کیونکہ کسی بھی یوروپین چیز کا پاس ہونا کچھ بھی چیز پاس نہ ہونے سے بہتر تھا۔ یوروپین لباس میں ہیٹ ہندوستانی نظروں میں سب سے زیادہ پرکشش اور باعثِ عزت تھا کیونکہ اس کی عجیب وغریب شکل وشباہت ہوتی تھی اور یہ جسم کے سب سے اعلیٰ حصّے یعنی سر کی زینت ہوتا تھا۔

باکھا نے سالوں سال ۳۸ ڈوگرا رجمنٹ کے کوارٹر گارڈ کے برآمدے میں لٹکے ہوئے سولہ ہیٹ کو دیکھا اور بڑے اشتیاق سے۔ جب وہ چھوٹا بچہ ہی تھا تو اِسے کسی عاشق یا پرستار کی حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا آیا تھا۔ جب کبھی اسے ۳۸ ڈوگرا رجمنٹ کے احاطے میں جانے اور اس میں جھاڑو لگانے کا موقعہ دیا جاتا تو وہ کوارٹر گارڈ کی طرف جانے کو ترجیح دیتا کیونکہ وہ وہاں سے دزدیدہ نظروں سے اس دل لبھانے والی شے کو دیکھ سکتا تھا اور اسے حاصل کرنے کے مختلف طریقوں کے منصوبے بنا سکتا تھا۔ اس ہیٹ کو حاصل کرنے کے جو منصوبے

وہ گھڑتا رہتا، ان کو سوچ کر ہی اسے مزہ آجاتا۔

باکھا نے سوچا کہ جن طریقوں سے اس ہیٹ کو حاصل کیا جا سکتا تھا ان میں یہ ایک تو یہ تھا کہ کوارٹر گارڈ کے انچارج کسی جمعدار یا صوبیدار سے دوستی کرے۔ لیکن اس پر عمل کرنا ناممکن سا تھا۔ کوئی بھی ایک جمعدار یا صوبیدار کوارٹر گارڈ کا دو دن اور رات تک انچارج نہ رہتا۔ ہر بارہ گھنٹے کے بعد گارڈ بدل جاتی اور چونکہ رجمنٹ کی بارہ کمپنیاں تھیں اور ہر کمپنی کی بہت سی پلاٹونیں ہوتی تھیں اس لیے کسی پلاٹون کا ایک صوبیدار یا جمعدار ایک دفعہ کوارٹر گارڈ کا انچارج بن جاتا تو پھر شاید زندگی میں دوسری بار اس کو اس ڈیوٹی پر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

چونکہ اس ترکیب میں کامیابی ممکن نہیں تھی، باکھا نے کسی سنتری سے پوچھنے کے بارے میں سوچا۔ جب وہ بچہ تھا تو ایک دفعہ اس نے ایک سنتری سے ایسا کہنے کی ہمت کی تھی تو اس سنتری نے وہی کہانی سنا کر اسے واپس بھیج دیا تھا کہ جس صاحب کا یہ ہیٹ ہے وہ گراونڈ تک گیا ہے اور اسے لینے کے واسطے آنے ہی والا تھا۔ اب اس میں پوچھنے کی بھی ہمت نہیں تھی کچھ سپاہی بھی اپنے آپ کو بہت سمجھتے تھے۔ ”وہ شاید مجھے گالی دیں گے“ اس نے اپنے آپ سے کہا ”اس سے تو یہ بہتر ہوگا کہ کبھی حوالدار سے ہی پوچھ لیا جائے۔ ہر حوالدار لمبی ملازمت والا تجربے کار آدمی ہوتا ہے اور میرے باپ کو جو بھنگیوں کا جمعدار تھا جانتا تھا۔ اس نے اگر مجھے ٹوپ کبھی نہیں دیا تو مجھ سے ٹھیک طرح تو بولے گا۔“ لیکن اس میں بولنے کا حوصلہ نہیں ہوا، دراصل ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ”ایسا کیوں ہے؟“ وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھتا ”کیا میں اب جا کر نہیں پوچھ سکتا لیکن بچپن میں میں ایسا کرنے کی ہمت کر سکتا تھا؟“ اسے اس کا جواب نہیں مل سکا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ بڑا ہونے پر اس نے وہ آزادی کھودی تھی، بچے کی وہ بے تحاشہ لاپرواہی اور حوصلہ مندی، اور یہ کہ اس نے اپنی وہ ہمت کھودی تھی اور یہ کہ اب وہ خوفزدہ تھا۔

پھر اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا کر دھوکا دے دیا کہ اسے ہیٹ کی ضرورت ہی کیا تھی کیونکہ وہ تو کباڑی کی دکان سے جب چاہے لے جا سکتا تھا یا انگریزوں

کی بارکوں میں سے کسی شامی سے مانگ سکتا تھا۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس ہیٹ کو حاصل کرنے کی آرزو ابھی تک اس کے دل میں تھی۔ سالوں تک وہ اس کے لیے گھلتا اور تڑپتا رہا تھا۔ اور اب بھی وہ کھڑا ہوا اسے حاصل کرنے کے بارے میں اسی دلچسپی اسی تجسس اور اسی خواہش سے سوچ رہا تھا جس سے وہ اس کی طرف سالوں سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ ٹوپ کوئی زیادہ صاف نہیں تھا۔ سالوں کی گرد اس پر جم گئی تھی۔ اس کا کپڑے کا رضائی کے نمونے کا غلاف تھا جس کا رنگ خاکی تھا مگر اب اُڑ کر مٹیالا سفید لگ رہا تھا۔ پھر اندر سے ہیٹ کی حالت کیا ہو گی اس کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔

باکھانے کوارٹر گارڈ کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے اس راستے سے دور جہاں سنتری آگے پیچھے قواعد کر رہے تھے، اس ٹوپ کی طرف خوب غور سے دیکھا۔ لیکن وہ اس سے اتنا ہی دور تھا جتنا ہمیشہ تھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "جا اور اس سنتری سے پوچھ لے۔" اس کے دل نے جواب دیا۔ "لیکن نہیں، میں بھنگی ہوں اور اگر میں نے اس سے اچانک کہہ دیا کہ مجھے وہ ہیٹ چاہیئے تو وہ سمجھے گا نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور وہ تو بڑا سخت معلوم ہوتا تھا۔ اس کے تو پاس پہنچنے کا بھی کوئی موقع نہیں ہے۔"

اس نے چاروں طرف مڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی اور تو اس کے پاس نہیں کھڑا تھا۔ ایک بھی تو آدمی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ ہر ایک آدمی اس دوپہر میں آرام کر رہا ہو گا۔ اسے ایک ناقابلِ مزاحمت خواہش نے جکڑ لیا کہ وہ جا کر اس ہیٹ کو چرا لے۔ کاش وہ سنتری وہاں نہ ہوتا۔ "اس ہیٹ کو چرایا تو جا سکتا ہے۔" اس نے سوچا۔ "جب سنتری اپنا چہرہ موڑ کر اپنے پہرے پر دوسری جانب آخر تک جائے گا۔ لیکن عین اس وقت کوئی آدمی مجھے اچانک چوری کرتے ہوئے پکڑ سکتا ہے۔ یہ ہیٹ اتنا بڑا ہے کہ اس کا چھپانا بھی مشکل ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اگر اسے چرا لیا تو میں اسے کبھی نہیں پہن سکوں گا۔ رجمنٹ کے ہر آدمی کو اِس کا پتہ ہے۔ نہیں یہ ناممکن بات ہے۔ اِس کو حاصل کرنے کا کوئی طریقہ ہے ہی نہیں۔" اس نے ایک دفعہ اور محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بارکوں کی طرف چل پڑا جن کے آخر میں، جیسا کہ اس کو پتہ تھا، حوالدار چرت سنگھ رہتا تھا۔

یہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، صرف کوئی سو گز۔ اس جگہ پر پہنچتے پہنچتے باکھا نے اپنی ایک ایسی شکل کا تصور کیا جس میں وہ سولہ ہیٹ پہن کر ہاکی کھیل رہا تھا۔ اس نے اِس میں اپنے آپ کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ اِس میں کتنا اہم لگ رہا تھا اور سب لڑکوں کی نظر کا مرکز تھا۔ پھر اسے اچانک یہ خیال آیا کہ سولہ ٹوپی تو ہاکی میں پہنی ہی نہیں جاتی۔ "میرے خیالات بھی کتنے بے وقوفانہ ہیں" اس نے سوچا۔ اسے انگریزی لباس کے لیے اپنے انتہائی شوق پر شرم آئی لیکن اسے اِس بات سے تسلی ہوئی کہ اس نے اپنے آپ کو اتنا بے وقوف تو نہیں بنایا جتنا رام چرن نے اپنے آپ کو اپنی بہن کی شادی پر ٹوپ اور نیکر پہن کر بنایا تھا۔

وہ ایک خندق پار کر کے بارکوں کی لمبی لائینوں کے پاس پہنچ گیا۔ جس بارک میں اسے جانا تھا وہ اب صرف دس گز پر تھی۔ اس کا برآمدہ لمبا تھا۔ وہ آخر کے کمرے پر پہنچ گیا جس میں حوالدار چرت سنگھ رہتا تھا۔ وہ کمرے سے آگے نکل گیا کیونکہ اسے ہمیشہ جب کوئی اسے دیکھ لیتا تو شرم آتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چور تھا۔ خوش قسمتی سے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس کے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ حوالدار گھر پر تھا یا نہیں۔ کوئی بھی معمولی آدمی جا کر حوالدار کو آواز لگا سکتا تھا یا اس کی کنڈی کھڑکھڑا سکتا تھا۔ وہ ایک بھنگی تھا اور وہ تو اس برآمدے کی حدوں میں اتنا آ گیا تھا کہ یہ برآمدہ "بھرشٹ" کہا جا سکتا تھا۔ باکھا نے چاہا کہ کاش، اگر بابو کے بیٹے کی سنائی کہانی ٹھیک تھی، جہانگیر شہنشاہ کا ایجاد کیا ہوا طریقہ اب ہوتا جس میں شہنشاہ کے گھر میں ایک گھنٹی لگی ہوئی تھی جو ایک زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور وہ زنجیر باہر کے دروازوں پر لٹکی رہتی تھی۔ اس زنجیر کو کھینچ کر فریادی بادشاہ کو یہ خبر پہنچا دیتا تھا کہ وہ اپنی فریاد سنانے کے لیے دروازے پر کھڑا ہے۔ شہر میں روٹی مانگنے کے لیے اسے چلّانا پڑتا تھا۔ اس کے پاس جب وہ رام چرن اور چھوٹا کے گھر جاتا تھا تو اُن سے ملنے کا بھی کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے اِس کے وہ زور سے آواز دے۔ آواز دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ رام چرن کی ماں اور چھوٹا کا باپ اس کی آواز پہچان لیتے اور اندر سے ہی اسے گالیاں دینا شروع کر دیتے کہ ہمارے لڑکوں کو کام سے بھگانے آیا ہے۔ اور اب تو البتہ نہ وہ چلّا

سکتا تھا اور نہ کچھ اور کر سکتا تھا۔ حوالدار سویا ہوا ہوگا۔ سپاہی بھی سب آرام کر رہے ہونگے اور ان کے آرام اور نیند میں خلل پڑے گا۔

وہ برآمدے کے باہر آگے پیچھے گھومتا رہا۔ پھر وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس کے خیالات اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ "میں نہیں جانتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کو اپنا صبح کا کیا ہوا وعدہ یاد ہوگا۔ ورنہ یہ سب وقت بے کار میں برباد ہو جائے گا۔ باپو مجھے کوس رہا ہوگا۔ ساری دوپہر میں نے کام نہیں کیا ہے۔ خیر اِس کی مجھے پرواہ نہیں۔ کبھی تو راکھا کو یہ کام کرنا چاہیئے۔ میں اسے ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ اگر میں نے آج دوپہر کے بعد چھٹی کر لی تو کیا ہو جائے گا۔ اس کی آنکھیں اس کچن کی طرف چلی گئیں جہاں چرت سنگھ کی کمپنی کے لیے کھانا پکتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ بچہ تھا تو وہ اکثر اس کچن میں سے روٹی لیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کا باپ "جی" کمپنی میں ایک معمولی بھنگی تھا۔ اُس کمپنی کے تمام ہاکی کھیلنے والوں کے چہرے اس کے سامنے آگئے۔ ایک ہوشیار سنگھ تھا جو سینٹر ہاف کی پوزیشن پر کھیلتا تھا اور وہ ٹیم کا سب سے عمدہ کھلاڑی تھا۔ لیکھ رام سینٹر فارورڈ کھیلتا تھا اور شو سنگھ رائٹ فل بیک کھیلتا تھا اور بلاشبہ پھر وہ اعلیٰ کھلاڑی چرت سنگھ تھا جو گول کیپر کے طور پر کھیلتا تھا۔ اسے وہ بات یاد آئی جو چرت سنگھ کے بارے میں مشہور تھی کہ جن دنوں وہ ہاکی نہیں کھیلتا تھا تو وہ ہسپتال میں ہوتا تھا جہاں اس کے زخموں اور اس کی خراشوں کی پٹی ہوتی تھی جو اسے ہاکی کھیلنے وقت لگتی تھیں! وہ اپنے ذہن میں وہ تصویر دیکھ سکتا تھا جب چرت سنگھ برٹش رجمنٹ کے خلاف میچوں میں گول کیپر بن کر کھڑا ہوتا تھا۔ وہ گول پر ہمیشہ آگے کو جھک کر کھڑا ہوتا تھا اور جوں ہی گیند اس کے سامنے آتی تھی وہ اس پر جھپٹ پڑتا تھا۔ بابو کا بیٹا کہتا تھا کہ چرت سنگھ کے جسم پر جتنے زخم تھے ان کی تعداد اتنی ہی تھی جتنے نشان تلوار اور نیزے کے راجپوت جنگجو رانا سانگا کے جسم پر تھے جو مغلِ اعظم کا فاتح تھا۔ اور سب سے زیادہ خوشگوار زخم جو اس نے کہا تھا۔ وہ اس کے دانتوں کا نکل کر باہر آنا تھا۔ اس نے اپنے دانت نکلوا کر سونے کا پترا چڑھے ہوتے نقلی دانت لگوا لیے تھے۔ اس واقعے پر طرح طرح کے مذاق کیے گئے

اور کسی نے ہنسی میں یہ بھی کہہ دیا کہ مشہور مثل "چور کی داڑھی میں تنکا" کو بدل کر "چور کے منہ میں سونے کے دانت" کر دیا جائے!

باکھا ابھی پوری طرح اپنے اِن خیالات کی دنیا میں کھویا بھی نہیں تھا کہ اس نے چرت سنگھ کو اپنے دروازے سے پیتل کا لوٹا ہاتھ میں لیے باہر نکلتے دیکھا۔ حوالدار نے برآمدے کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے چہرے اور آنکھوں پر خوب پانی ڈالا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے میں اتنا مصروف تھا اور اس کی نیند کا خمار بھی ابھی باقی تھا کہ اس نے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے باکھا کو نہیں دیکھا۔ بھنگی کا لڑکا گھبرا کر اٹھ گیا اور ڈری ڈری نظروں سے اپنا ہاتھ سر تک اٹھا کر بولا۔

"سلام! حوالدار جی۔"

"اوئے باکھیا آجا۔ کیا حال ہیں تیرے" چرت سنگھ نے جوش سے کہا۔ "میں تجھے آج کل رجمنٹ کے ہاکی میچوں میں بھی نہیں دیکھتا۔ تو اپنے آپ کو کہاں چھپا کر رکھتا ہے؟"

"حوالدار جی، بس کام میں لگا رہتا ہوں" باکھا نے جواب دیا۔

"اوہ، کام، کام، چھوڑ کام کو!" چرت سنگھ زور سے بولا اور اپنی ہمدردی اور نیکی کا اظہار کرتے ہوئے وہ یہ بھول گیا کہ آج صبح ہی وہ باکھا پر اس کے کام کی غفلت پر چلایا تھا۔

باکھا کو اس تضاد کا احساس تھا لیکن وہ مجموعی طور پر چرت سنگھ کو اتنا پسند کرتا تھا کہ وہ کسی بھی بات کو اپنے ہاکی ہیرو کی تعریف کے راستے میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ حوالدار کی اِس وقت کی مسکراہٹ سے بڑی خوشگوار جانی پہچانی چمک پھوٹ رہی تھی۔ باکھا یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ "اِس آدمی کے لیے" اس نے اپنے آپ سے کہا "میں زندگی بھر خوشی سے بھنگی رہ سکتا ہوں۔ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں!"

چرت سنگھ اٹھا اور اس نے گھر کے کتے ہوئے کپڑے کی دھوتی کے کنارے سے اپنا منہ پونچھا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا حقّہ اٹھایا جس کا پانی ڈالنے والا پیندا ناریل کے خول کا تھا اور کوئلہ اور تمباکو رکھنے کے لیے چلم مٹی کی اور نَے

بڑی پتلی اور عمدہ بنی ہوئی تھی۔ چرت سنگھ نے حقّے کی گردن پر سے چلم کو اٹھایا اور باکھا سے بولا۔ " جا ئیو اور اس میں میرے لیے کچن میں سے دو کوئلے لے آ۔"

لڑکا حیران و ششدر رہ گیا، یہ کہ ایک ہندو اسے اپنی چلم کے لیے جلتے ہوئے کوئلے لانے کو کہہ رہا ہے، جو وہ اپنے حقّے پر رکھ کر پئے گا! ایک لمحے کے لیے تو اسے یہ محسوس ہوا کہ اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہے۔ لیکن پھر اس عجیب بات نے اس کے اندر ایک خوشگوار جوش بھر دیا۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے چرت سنگھ سے چلم لی اور مسرّت میں لپٹا ہوا پچاس گز پرے کچن کی طرف چل دیا۔

" اور رسوئیے کو میرے پاس بھیجیو" چرت سنگھ نے پیچھے سے آواز دی " اور اسے کہیو کہ میری چائے لیتا آئے۔"

" بہت اچھا حوالدار جی " باکھا نے کہا اور بغیر پیچھے دیکھے چلتا رہا، اس ڈر سے کہ کہیں وہ اپنے آپ کو اس لاثانی عزت کے لیے نا اہل نہ ثابت کر دے جو ایک ہندو نے اپنی چلم کے لیے آگ بھرنے کا نازک کام اسے دے کر بخشی تھی۔ " سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خشک ہے یا گیلی ہے" اس نے آپ سے کہا " میں حیران ہوں کہ کیا چلم بھرشٹ ہو سکتی ہے؟" اسے خود ہی اس کا جواب مل گیا۔ " اوہاں تمبا کو گیلا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھرشٹ ہو سکتا ہے" ایک لمحے کے لیے تو اسے یہ شک ہوا کہ کیا چرت سنگھ پورے طور پر آگاہ اور ہوش میں تھا جب اس نے اسے یہ کام سونپا۔ " شاید وہ بھول گیا اور اچانک محسوس کرے کہ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ میں بھنگی ہوں؟" جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے پرماتما کا شکر ادا کیا کہ چرت سنگھ جیسے آدمی بھی تھے۔ وہ اطمینان سے چلنے لگا۔ اس کے قدموں میں ایک مسرّت تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ضبط سے کام لیا ہوا تھا مبادا بارکوں میں کسی کی توجہ اس کی طرف کھنچ جائے اور وہ دیکھ لیں کہ وہ حوالدار کی چلم لیے جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ٹھوکر کھانے سے بچا رہا تھا کیونکہ اس کی روح میں اس آدمی کے لیے

محبت، اشتیاق اور پرستش تھی جس نے اسے ایک بھنگی کو یہ کام سونپے جانے کے قابل سمجھا تھا اور اس کی آنکھیں اندر کی طرف اس کی روح میں جھانک رہی تھیں۔

وہ جا کر کچن کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہاں ایک رسوئیا مٹی کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہوا آلو چھیل رہا تھا اور آگ پر رکھے ہوئے ایک بڑے پیتل کے برتن میں سے اس کے ڈھکنی کے نیچے سے بھاپ اڑ کر باہر نکل رہی تھی۔

"مہربانی کر کے مجھے حوالدار چیرت سنگھ کے لیے تھوڑے سے انگارے دے دو" باکھا نے کہا

رسوئیے نے ایک لمحے کے لیے باکھا کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "تو کون ہے؟" اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ چہرہ پہلے کہیں دیکھا تھا مگر پہچان نہیں پا رہا تھا۔ "شاید یہ ایک کھدائی کرنے والا چھوٹے درجے کا سپاہی ہوگا" وہ اس نتیجے پر پہنچا کیونکہ اس کے ہاتھ میں حوالدار چیرت سنگھ کی چلم تھی۔ ایسے سپاہی کالے رنگ اور گندے کپڑے والے عموماً گھسیارے ہوتے تھے، اس لیے کسی کو اُن سے آگ وغیرہ منگوانے اور اس قسم کا چھوٹا موٹا کام کرانے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس باورچی پر حوالدار چیرت سنگھ کا احسان بھی تھا۔ حوالدار نے چھٹی پر جانے سے پہلے اسے ایک صاف نئی قمیص اور ایک سفید پگڑی دی تھی۔ اس نے آگ میں سے دو جلتے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے نکالے اور باکھا کے سامنے رکھ دیے۔ باکھا نے ایک ایک کر کے جلتے ہوئے کوئلے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر چلم میں ڈال لیے۔ باکھا کو اپنے صبح کے خواب میں آئی وہ چھوٹی لڑکی اچانک یاد آ گئی جس کی ہتھیلی پر سنار نے ایک جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا تھا۔

"مہربانی" اس نے چلم کو آدھے جلے ہوئے کوئلوں سے بھر کر کہا۔ "حوالدار صاحب نے یہ بھی کہلوایا ہے کہ میری چائے بھیج دو۔" اس نے اس اچانک فقرے میں بڑی عاجزی سموتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اسی جگہ پر واپس آ گیا جہاں اب ایک آرام کرسی پر چیرت سنگھ بیٹھا ہوا تھا جو اس نے کہیں سے کھینچ لی تھی اور باکھا نے اسے چلم تھما دی۔ حوالدار نے

لاپرواہی سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور چلم کو پکڑ کر ناریل کے خول والے حقے پر رکھ لی اور خوب کش پر کش لگانے لگا۔

باکھا اب کچھ بے صبری سی محسوس کر رہا تھا اور برآمدے کے پاس ہی ایک اینٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ بے صبری حقّے کی وجہ سے تھی۔ حقّے کو دیکھ کر وہ ہمیشہ بے صبر ہو جاتا تھا اور پھر وہ ہاکی کے لیے بھی بڑا بے تاب تھا۔ حوالدار نے ایک لفظ بھی اس کے بارے میں نہیں کہا تھا۔ کیا وہ بھول گیا تھا؟۔ باکھا سوچنے لگا۔ وہ انتظار میں بیٹھا رہا اور اس کے اور حوالدار کے درمیان جو بھدّا پن ایک اُداسی بن کر پھیلا ہوا تھا، اسے بڑا برا لگ رہا تھا۔ اتنے میں رسوئیا ایک لمبا پیتل کا گلاس اور چائے کا جار لیے چلا آیا اور حوالدار نے اپنے دوست کا تناؤ اور گھبراہٹ بڑی آسانی سے خود ہی دور کر دی۔

"جا وہ برتن اٹھا لا جس میں سے چڑیاں پانی پیتی ہیں" اس نے باکھا کو لکڑی کے ایک ستون کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں سے پانی پھینک دیو۔"

باکھا نے جیسا حوالدار نے کہا کیا اور اب اس کے ہاتھ میں ایک صاف برتن تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا جب چرت سنگھ چائے کے جار میں سے اس برتن میں چائے ڈالنے لگا۔

"نہیں نہیں حضور" باکھا نے ایک مخصوص ہندوستانی مہمان کی طرح منع کیا۔

چرت سنگھ نے چائے انڈیل دی۔

"پی لے۔ پی لے میرے بیٹے۔"

"بہت بہت شکریہ حوالدار جی۔" باکھا نے کہا "تمہاری بڑی بڑی مہربانی۔"

"پی لے، چائے پی لے۔ تو بڑی محنت کرتا ہے۔ اس سے تیری تھکاوٹ دور ہو جائے گی" چرت سنگھ بولا

جب باکھا نے چائے حلق میں اتار لی تو وہ برتن اٹھا کر اسی جگہ رکھ آیا۔ اِتنے میں چرت سنگھ نے جار میں بچی ہوئی چائے اپنے گلاس میں ڈال لی تھی اور اسے

چپ چاپ پی رہا تھا۔

"اور ہاں ہاکی بھی تو تجھے دینی ہے۔" اس نے اپنے ہونٹوں اور باریک مونچھوں کو اپنی زبان کی نوک سے چاٹتے ہوئے کہا۔

باکھا نے اوپر دیکھا اور اس نے اپنے چہرے پر احسان مندی لانے کی کوشش کی۔ اسے کوئی زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی کیونکہ ایک سیکنڈ میں ہی اس نے اپنے آپ کو عجز و انکسار کا چھوٹے سے چھوٹا بونا بنالیا اور بغیر آواز کیے حوالدار کو دیکھتا رہا۔ چائے پینے سے اس کا چہرہ گرم تھا اور اس کے دانت اپنی غلامانہ مسکراہٹ میں چمک بھی رہے تھے۔ اپنے محسن کے لیے جذبۂ احسان مندی اور تعریف سے اس میں ایک تناؤ سا بھی پیدا ہو گیا تھا۔ "یہ اچانک میری قسمت کیسے بدل گئی ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا' "حوالدار سے جو ہندو تھا اور جس کا شمار رجمنٹ کے اہم ترین آدمیوں میں ہوتا تھا' اتنی مہربانی!" وہ چرت سنگھ کو عجیب' حیران نظروں سے دیکھتا رہا۔

چرت سنگھ نے اٹھ کر اپنے کمرے کا بغل کا دروازہ کھولا اور ایک منٹ کے لیے غائب ہو گیا۔ پھر وہ ایک تقریباً نئی ہاکی لے کر باہر نکلا جو شاید ایک دفعہ ہی استعمال ہوئی تھی۔ اس نے اس لاپرواہی سے ہاکی باکھا کو دے دی جس لاپرواہی سے اس نے اُسے چلم آگ لانے کے لیے دے دی تھی۔

"لیکن حوالدار جی یہ تو نئی ہے۔" باکھا نے ہاکی لیتے ہوئے کہا۔

"چل اب دوڑ جا۔ نئی ہو یا پرانی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" چرت سنگھ بولا "اسے اپنے کوٹ میں چھپالے اور کسی سے نہ کہیو۔ جا میرے بیٹے۔"

باکھا نے اپنا سر جھکا لیا اور حوالدار کی طرف دیکھ نہ سکا۔ وہ اتنے سخی آدمی کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی اس مہربانی پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اتنا احسان مند تھا اور یہ احسان مندی اس کے جسم میں ایسی سرسراہٹ پیدا کر گئی تھی کہ وہ نہ بول سکتا تھا اور نہ ٹھیک طرح چل سکتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے اتنے فراخدل' محسن اور مہربان کی نظروں سے غائب ہونے کے لیے وہ فاصلہ کیسے طے کرے جو صرف دس گز کا تھا۔ اس کے لیے سارے ماحول میں ایک الجھن سی تھی؛

وہ چلتا ہوا ایک عجیب بے آرامی محسوس کر رہا تھا۔

"عجیب بات ہے، واقعی کتنی عجیب ہے۔ کتنا غضب کا آدمی ہے۔ کتنا مہربان۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ اتنا رحم دل ہے۔ مجھے پتہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ہر کام ہنسی خوشی سے کرتا ہے۔ کتنا فراخدل اور اچھا آدمی ہے۔ دیکھو نا مجھے ایک بالکل نئی ہاکی دے دی،" وہ سوچتا رہا۔

اس نے بے صبری سے ہاکی اپنے اوور کوٹ کی تہوں میں سے جہاں اس نے اسے چھپالیا تھا نکال لی۔ یہ چوڑی لکڑی کی ایک خوبصورت ہاکی تھی جس پر انگریزی کی مہریں لگی ہوئی تھیں اور اسی وجہ سے باکھا کی نظروں میں وہ بہترین ہاکی تھی جو اب تک دنیا میں بنی تھی۔ اس کا دستہ چمڑے کا تھا۔ "خوبصورت، خوبصورت" اس کا دل اپنی انتہائی مسرت اور جوش میں پکارتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کونے پر مڑ گیا اور خندق کو پار کر گیا۔ اور اب وہ اپنے محسن کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ اطمینان کر کے کہ اب کوئی بھی آدمی اس کے اس انعام کے بارے اس کے بیوقوفانہ غرور اور مسرت کو دیکھنے والا نہیں تھا، اس نے ہاکی کو زمین پر اس طرح رکھا جیسے گیند کو مارنے سے پہلے رکھتے ہیں۔ اس نے اسے ہاتھ کے زور سے جھکایا۔ اس میں بڑی لچک تھی اور وہ بڑی عمدگی سے جھک گئی۔ باکھا جانتا تھا کہ یہ لچک ایک اچھی ہاکی کی پہچان تھی۔ اس نے جلدی سے اس مٹی کو صاف کر دیا جو ہاکی کے نچلے حصے میں لگ گئی تھی اور اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے اس بات کا ڈر ہو کہ کوئی آدمی آکر اسے چھین لے گا۔ اس نے اپنے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی اور وہ خود بھی یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ ہاکی اس کے قبضے میں تھی۔ وہ اس حقیقت کو ناقابلِ یقین سمجھ رہا تھا کہ وہ ہاکی کا مالک تھا۔ باوجود اس کے کہ اس نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا وہ اس خیال کو نہیں جھٹک سکا کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا حتیٰ کہ وہ کسرت گھر کے باہر کے کھیل کے میدان میں پہنچ گیا جو ہندوستانی افسروں کے کوارٹروں کے پیچھے تھا۔ اس نے یہاں ایک چھوٹے سے گول پتھر کو اِدھر اُدھر مارنا شروع کر دیا۔ مگر اچانک اسے محسوس ہوا کہ ایسا کرنے سے اس کی ہاکی پر نشان پڑ جائیں گے۔ اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا

اور اپنے جسم کے خلاف دبائے رکھا۔ اس نے پھر اپنے خیالات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ "اب میری عام قسمت پھر واپس آگئی ہے۔ کاش وہ صبح والا واقعہ نہ ہوتا۔"

باکھا نے اپنے ذہن میں چرت سنگھ کا چہرہ لانے کی کوشش کی۔
اس کے چہرے پر بھلکڑپن کا شبہ ابھی تک ہو رہا تھا۔ "مجھے امید ہے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔" باکھا نے سوچا "میں امید کرتا ہوں کہ اس کا دماغ غیر حاضر نہیں تھا۔ ہو بھی سکتا تھا۔ تو کیا اِن حالات میں مَیں اِس کی ہاکی سے کھیلنے کا حوصلہ کر سکتا ہوں؟ کھیلنے سے یہ خراب ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسے اچانک محسوس ہو گیا کہ اس نے کوئی ایسی چیز دے دی تھی جو اسے نہیں دینی چاہیئے تھی تو غضب ہو جائے گا کیونکہ میں ہاکی کو ٹوٹی پھوٹی بلکہ استعمال کی ہوئی بھی واپس نہیں کر سکتا۔ اور میں اس قسم کی نئی ہاکی خریدنے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن اِس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ نئی یا پرانی تو اسے لے کر دوڑ جا اور کسی کو نہ بتائیو؟ بلاشبہ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میں تو پاگل ہوں جو یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ بھلکڑ ہے۔ وہ کتنا مہربان ہے اور میں اس کے بارے میں یہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ میں بڑا بے وقوف ہوں۔" کیونکہ باکھا کے خیالات دِل کو دکھانے والے تھے اِس لیے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ "یہ سہ پہر کتنی خوبصورت ہے!" اس نے کہا اور اپنے خیالات کی بندش سے اپنے چہرے کو آزاد کرتے ہوئے اس خوشگوار ہوا کو سونگھا جو شمال کی طرف سے پہاڑیوں پر سے آ رہی تھی۔ وہ پت جھڑ کے موسم کی سہانی دھوپ کے بارے میں جانتا تھا کہ صرف اتنی گرم ہوتی ہے کہ گرم کپڑے پہنے ہوئے کسی دل کو مسرت عطا کر دے۔ اِس وقت صاف شفاف چمکیلی دھوپ میں باکھا کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا اور آسمان کا کھلا برتن صاف اور گرم دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خوشی سے کودنے لگے۔

وہ چلنے ہی والا تھا کہ اسے پھر محسوس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔ کوئی نہ کوئی تو آس پاس یقیناً ہوگا۔ کوئی گزرتا ہوا سپاہی یا لڑکوں میں سے ہی کوئی۔ اس لیے اگر اس نے اپنی مسرّت کو اور بڑھانا تھا تو چلنے پھرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس نے چلنا شروع کر دیا۔ وہ اکڑ کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ پھولا ہوا تھا، سر بلند تھا اور اس کی ٹانگیں ایسی سخت تھیں جیسے لکڑی کی بنی ہوئی ہوں جنھیں اس کے کولہوں کی بھدی حرکت ہلا رہی تھی۔ اس لیے تو وہ کسی مغرور سپاہی کی اکڑ والی چال بن گئی تھی۔

پھر اسے یہی نظر آگیا کہ وہ بے وقوفوں کی طرح اکڑ کر چل رہا تھا اور اسے اس کا احساس ہو گیا۔ وہ اچانک رک گیا۔ اسے کچھ ٹھیک سا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا نیا حاصل کیا ہوا اعتماد پھر چور چور ہو گیا۔

اب اس میں صبر نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی آجائے اور اس کی تنہائی کو دور کر دے۔ اگر کوئی سپاہی بھی ادھر سے گزرے گا تو وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور اگر اس کے ساتھی لڑکوں میں سے بھی کوئی آگیا تو وہ اسے بلا کر اپنی نئی ہاکی جو اسے ملی تھی دکھا دے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ چھوٹا آجائے کیونکہ وہ اس کو ہاکی دکھانا پسند کرے گا، یا رام چرن۔" لیکن نہیں مجھے رام چرن کو اپنی ہاکی بالکل نہیں دکھانی چاہیئے ورنہ وہ جاکر چرت سنگھ کو بتا دے گا اور اسے اسی طرح کی ہاکی اس سے مانگ کر پریشان کرے گا۔ حوالدار نے کہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اگر رام چرن کو یہ سوجھ گیا کہ وہ بھی جاکر چرت سنگھ سے ہاکی مانگ لے۔" اس نے خواہش کی کہ بابو کے بیٹے آجائیں۔ اُن کے پاس گیند تھی۔ بڑے لڑکے نے اسے انگریزی پڑھانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ شاید وہ ایک سبق میچ شروع ہونے سے پہلے ہی دے دے۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی بھی آجائے، کوئی بھی جو اس کے ذہن کو بھر سکے جو سوکھ گیا تھا، اچانک خالی ہو گیا تھا۔

اب وہ بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کا منہ کبھی اِس طرف مڑ جاتا تھا، کبھی اُس طرف اور اس کی نظریں کچھ کھوئی کھوئی سی تھیں۔ آخر کار اسے بابو کا لڑکا نظر آگیا، چھوٹے والا لڑکا جو اپنے گھر کی بیٹھک میں سے دوڑ کر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی ہاکی تھی، وہ منہ میں کچھ کھا رہا تھا اور اس کے کرتے کے کونے میں میٹھی گولیاں بندھی ہوئی تھیں۔ باکھا جانتا تھا کہ چھوٹے لڑکے کو ہاکی کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ آسان قدمی سے نیچے کی طرف بڑھا

لیکن یہ چال اس کے نچلی ذات کے ہونے کی وجہ سے اور اس کے چہرے کی مسکین مسکراہٹ کی وجہ سے بڑی بھدی سی لگی۔ اسے بابو کے لڑکے پسند تھے۔ وہ ان کی عزت کرتا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ اونچی ذات کے ہندو تھے جن کی عزت کرنا اس کے لیے بھنگی کے لڑکے کے طور پر لازمی تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ان کا باپ رجمنٹ میں ایک بڑے اہم عہدے پر تھا۔ بس خود کرنل صاحب سے تقریباً دوسرے درجے پر۔

چھوٹا لڑکا بڑا جوش وخروش دکھاتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا۔

"دیکھ یہ ہے وہ ہاکی جس کے بارے میں میں نے آج صبح تجھے کہا تھا۔ چرت سنگھ نے مجھے دی تھی۔"

"اوہ یہ تو بڑی خوبصورت ہے۔" باکھا نے رائے ظاہر کی، لیکن، اس نے مذاق میں کہا۔ "ذرا میری ہاکی تو دیکھ، یہ تیری ہاکی سے زیادہ اچھی ہے۔ ہا۔ ہا، یہ تیری سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"مجھے دیکھنے دے" چھوٹے لڑکے نے کہا

باکھا نے اسے ہاکی دے دی۔

"اوہ یہ تو بالکل میرے جیسی ہے" بچہ چلایا۔

باکھا کو محسوس ہوا کہ چرت سنگھ نے اس پر کوئی غیر معمولی مہربانی نہیں کی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ اس کی مہربانی تو تھی ہی۔ "بابو کے بیٹے آخر بابو کے بیٹے ہیں۔ وہ انھیں تو ہاکیاں دے گا ہی۔ لیکن اس نے ایک مجھے بھی جو بھنگی ہے دے دی تھی تو یہ اس کی غیر معمولی مہربانی تو تھی ہی۔" باکھا نے سوچا۔

"او باکھے تو کیا میچ کھیلنے کے لیے تیار ہے؟" بچے نے پوچھا جیسے وہ ہی ساری ٹیم کا کپتان ہو!

"ہاں میں تیار ہوں۔" باکھا نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اس کے لیے جو ہمدردی باکھا کے دل میں تھی اس کی ایک جھلکی بھی اس نے اپنی بات میں نہیں آنے دی۔ وہ جانتا تھا کہ بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے کوئی نہیں کھلائے گا۔

"تیرا بڑا بھائی کہاں ہے؟" اس نے بچے سے پوچھا

"وہ اپنا کھانا ختم کرنے والا ہے۔ ابھی آجائے گا۔ میں جاکر ہاکیاں اور گیند لے آتا ہوں۔ لڑکے بھی سارے آنے ہی والے ہوں گے۔" اور وہ باکھا کے دل پر ایک عجیب سا اثر چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

"بے چارہ غریب بچہ! اور وہ اسے کھیلنے نہیں دیں گے۔ لیکن اسے کھیلنے کا کتنا شوق ہے۔ بڑا ہو کر یہ ضرور کوئی غیر معمولی آدمی بنے گا۔ شاید بڑا بابو بن جائے یا صاحب۔ اس کی آنکھیں اسی طرح جھپکتی ہیں؟" باکھا نے پوچھا۔

"او باکھے!" کسی نے اس کے خیالات میں خلل ڈالا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا اور رام چرن تھے اور اُن کے پیچھے پیچھے اور لڑکے آرہے تھے۔ توپچی کے بیٹے نعمت اور عظمت، درزی کا بیٹا اسماعیل، بینڈ ماسٹر کا لڑکا علی، عبداللہ، حسن اور حسین اور بہت سے لڑکے جو اس کے لیے اجنبی تھے۔ شاید ۳۱ پنجابی رجمنٹ کے لڑکے ہوں گے۔ باکھا ان کی طرف بڑھا۔ چھوٹا دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور اس کے کان میں بولا "میں نے انھیں بتایا ہے کہ تو صاحب کا بیرا ہے۔ اِن لوگوں کو نہیں پتہ کہ تو بھنگی ہے۔"

"ٹھیک" باکھا مان گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا ۳۱ پنجابی رجمنٹ کے کچھ قدامت پسند لڑکوں کی تسلی کے لیے کیا گیا ہے تاکہ وہ بھرشٹ نہ ہوں۔

"دیکھ میرے پاس کتنی غضب کی نئی ہاکی ہے۔" باکھا بولا۔ اس نے ہاکی اپنے دوست کو دکھائی۔ پھر وہ بولا۔ "رام چرن کو اِس کے بارے میں کچھ نہ کہیو۔ چرت سنگھ نے مجھے دی ہے۔ میں اس سے گول پہ گول کر دوں گا۔"

"بہت اچھی! غضب کی ہے، خوب خوب۔ بڑی خوبصورت" چھوٹا خوشی سے چلّایا "سالے تو بڑی قسمت والا ہے" اس نے باکھا کی پیٹھ پر ایک تھپڑ جمایا اور اس کے اوور کوٹ پر جمی ہوئی دھول کا ایک چھوٹا سا غبار ہوا میں اچھلا۔

"ہاں تو لڑکو تیار ہو جاؤ" اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

جب ٹیم کے چھٹنے کا وقت آیا تو بابو کا چھوٹا لڑکا آیا اور اُس نے ہاکیاں چھوٹا کے آگے ڈھیر کر دیں اور اپنے انعام کی امید کرنے لگا۔ لیکن چھوٹا نے تو اپنی ٹیم کے گیارہ کھلاڑیوں کا انتخاب پہلے ہی کر لیا تھا۔

"بچے کو بھی کِھلائے" باکھا نے اس کی سفارش کی۔

"نہیں اس کے ساتھ بڑی مصیبت ہو جائے گی۔" چھوٹا نے اس کے کان میں کہا، "ہم اسے نہیں کِھلا سکتے۔ اسے چوٹ لگ جائے گی اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ میچ بڑے لڑکوں کے ساتھ ہے۔"

باکھا نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے پتہ لگا کہ چھوٹا کی اس لڑکے سے ویسے بھی نہیں بنتی تھی اور وہ مجبور تھا کیونکہ وہ دونوں کو ہی پسند کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے بڑا دکھ ہوا جب اس کے بڑے بھائی کے سوائے اور کسی لڑکے نے اس بچے کو لینے کے لیے ہاں نہیں کی اور بڑا بھائی اس کی یہ کہہ کر تسلی کر رہا تھا کہ یہ بڑے لڑکوں کا میچ تھا اور بہت اہم تھا اور شاید وہ اسے کبھی نہ کھلائیں۔

جب آخر کار مایوسی کی گھڑی آگئی تو چھوٹے لڑکے نے زیادہ آسانی سے اسے قبول کر لیا کیونکہ ایک تو اس کے بھائی نے اسے تسلی دے دی تھی اور دوسرے باکھا نے اپنی مسکراہٹوں سے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

جب چھوٹے لڑکے کی کسی نے پرواہ نہیں کی تو مجبوری کی وجہ سے اس نے اس بات میں دلچسپی لی کہ اسے ریفری بنا دیا جائے! لیکن چھوٹا نے اسے ریفری کے طور پر بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اب تو چھوٹا لڑکا بڑا اداس ہو گیا۔ میچ شروع ہو گیا تھا۔ وہ لڑکوں کے کپڑوں کے ڈھیروں کے پاس کھڑا ہو گیا جو ہاکی کے میدان کے کنارے پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش وہ اتنا بڑا ہوتا جتنا چھوٹا تھا۔ پھر تو اسے بھی کھیلنے کو کہا جاتا اور پھر وہ اسی کی طرح نیکر بھی پہن سکتا تھا۔ اور پھر وہ پورا صاحب نظر آتا کیونکہ وہ اتنا کالا بھی نہیں تھا جتنا چھوٹا تھا۔

باکھا ایک سیکنڈ کے لیے چھوٹے لڑکے کے پاس اپنا اوورکوٹ پھینکنے کے لیے آیا۔ اس نے اوورکوٹ اتارے بغیر کھیل شروع کر دیا تھا۔

"چھوٹے بھیّا ذرا اس کا دھیان رکھنا۔ رکھوگے نا؟" اس نے بچے سے اس لہجے میں کہا جیسے اسے کوئی کام سونپ دیا ہو اور اس سے اس کی ٹیم میں نہ لیے

جانے پر تسلی ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ دوڑ کر میدان میں اپنی جگہ پر چلا گیا۔ چھوٹا بچّہ اس وقت رو سکتا تھا مگر کھیل دیکھنے میں لگ گیا — باکھا ضرور گول کرے گا' اس نے سوچا۔

یہ ایک غیر معمولی منظر تھا۔ گراؤنڈ میں لڑکے ٹڈیوں کی طرح آگے پیچھے اچھل رہے تھے۔ وہ یہ کھیل کسی تنظیم سے نہیں کھیل رہے تھے۔ باکھا گیند کو لڑھکاتا ہوا، آگے دھکیلتا ہوا اور مخالفوں سے بچاتا ہوا، ۳۱ پنجابی رجمنٹ کے لڑکوں کے گول پر لے گیا تھا لیکن وہاں گول کو بچانے والوں کی ایک بھیڑ نے اسے پکڑ لیا اور گھیر لیا۔ وہ گیند کو باہر مار کر، دھکا دیتے ہوئے، چلاتے ہوئے اور اڑتے ہوئے گول بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن باکھا نے گیند کو سارے لڑکوں کی ٹانگوں میں سے اچھال کر پھینک دیا اور آگے بڑھ کر گیند کو مار کر گول کر دیا۔

زیادہ عمدہ کھیل سے اس طرح ہار کر گول کیپر نے غصے میں اپنی ہاکی باکھا کی ٹانگوں میں مار دی۔ اس پر چھوٹا، رام چرن، علی، عبداللہ اور ۳۸ ڈوگرز رجمنٹ کے دوسرے لڑکے ۳۱ پنجابی رجمنٹ کے گولچی پر ٹوٹ پڑے۔

جلد ہی میدان میں ایک آزادانہ جنگ شروع ہو گئی!

"یہ فاؤل تھا، بالکل فاؤل تھا۔" ۳۱ پنجابی رجمنٹ کا کپتان چلّا رہا تھا۔

"فاؤل نہیں تھا۔ فاؤل نہیں تھا۔" چھوٹا غصے میں پورا اٹھتے ہوئے جواب میں بولا

۳۱ پنجابی رجمنٹ کا کپتان لڑکوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا غصے میں آگے بڑھا اور اس نے چھوٹا کو کالر سے پکڑ لیا۔ ایک دفعہ اور خوب گتھم گتھا ہوئی اور لڑکے چیخے چلائے اور کافی مارا ماری ہوئی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ — لڑکوں نے اپنی ہاکیوں کا پوری طاقت اور بڑے وحشیانہ طریقے سے استعمال کیا اور لڑکوں کی بھیڑ میں ایک دوسرے کو مارنے کا جذبہ اس انتہائی نقطے پر پہنچ گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے نہیں بلکہ جنگلی شکاری تھے۔ چھوٹا نے اپنے مخالف کو کندھے سے پکڑ لیا تھا اور کچھ دیر تک دونوں بری طرح دھینگا مشتی کرتے رہے

اور دونوں نے ایک دوسرے کے خوب مُکّے مارے اور کپڑے تک پھاڑ ڈالے۔ جب چھوٹا کا دشمن چھوٹا کے وار برداشت نہ کر سکا تو اس نے اپنے لڑکوں کو آواز دی اور کچھ گز دوڑ کر پیچھے بھاگ گیا۔

"ان پر پتھر مارو، پتھر" چھوٹا چلّایا۔

اس پر ۳۸ ڈوگرہ رجمنٹ کے لڑکے اپنے دشمنوں سے علیحدہ ہو گئے اور دوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر ان لڑکوں پر پھینکنے شروع کر دیے۔

اپنے جوش و خروش اور غصے میں انھیں چھوٹے لڑکے کا خیال بھی نہیں رہا جو کپڑوں کے پاس ان کے اور ان کے مخالفوں کے درمیان کھڑا تھا اور پتھروں کی زد میں تھا۔ زیادہ تر پتھر اس کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس لیے وہ اگرچہ ڈرا ہوا تھا مگر محفوظ تھا۔ لیکن رام چرن کا پھینکا ہوا ایک پتھر اس کے سر پر لگا اور اس کے گولہ پڑ گیا۔ اس نے ایک دل ہلا دینے والی چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سارے لڑکے اس کی طرف دوڑے۔ اس کے سر کے پیچھے سے خون کی دھاریاں بہہ رہی تھیں۔ باکھا نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور اسے اس کے گھر لے گیا۔ مگر اس کی بدقسمتی سے اس بچے کی ماں نے یہ سارا جھگڑا اور شور سن لیا تھا اور وہ اتفاق سے یہ دیکھنے نکلی تھی کہ اس کے بچے تو محفوظ ہیں۔ اس کا سامنا باکھا سے ہوا۔

"او مالکوں کو کھانے والے، گندے بھنگی" وہ چلائی "تو نے میرے بیٹے کو کیا کیا؟"

باکھا اپنا منہ کھولنے ہی والا تھا کہ اسے بتا دے کہ کیا ہوا تھا لیکن اس کی ماں کو یہ سوال کرتے کرتے اپنے بچے کے سر سے نکلتے ہوئے خون اور اس کے زرد، بے جان اور بے ہوش چہرے سے سب کچھ پتہ لگ گیا تھا۔

"او اپنے مالکوں کو کھانے والے۔ تو نے یہ کیا گیا۔ تو نے تو میرے بچے کو مار ڈالا؟" وہ زار و قطار روتی ہوئی اپنی چھاتی پیٹ کر بولی۔ خوف کے مارے کبھی اس کا منہ لال ہو رہا تھا، کبھی نیلا "اسے مجھے دے دے، میرا بچہ مجھے دے دے۔

تو نے میرے بچے کو زخمی تو کیا ہی میرے گھر کو بھی بھرشٹ کر دیا۔"

"ماں ماں تم کیا کہہ رہی ہو؟" اس کا بڑا بیٹا بیچ میں بولا "اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے اسے زخمی نہیں کیا۔ وہ تو دھوبی کا لڑکا تھا، رام چرن۔"

"دور ہو جا، دور ہو جا نمک حرام" ماں چلائی "تجھے موت آجائے۔ تو نے اپنے بھائی کی دیکھ بھال کیوں نہیں کی؟"

باکھا نے بچے کو دے دیا اور خوف زدہ، مسکین صورت بنائے اور کسی بھوت کی طرح خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت مایوس اور پژمردہ محسوس کیا۔ کیا چرت سنگھ کی سخاوت کا مزہ صرف آدھ گھنٹے تک ہی تھا۔ اس نے ایسا کیا کیا تھا کہ اس کے ساتھ اتنا برا سلوک ہوتا تھا۔ وہ تو اس بچے سے پیار کرتا تھا۔ اسے بہت محسوس ہوا تھا جب چھوٹا نے اسے کھیل میں شامل نہیں کیا تھا۔ پھر اس کی ماں کو کیا حق تھا کہ اسے گالیاں دے جب اس نے اس کے بیٹے کے ساتھ اتنی ہمدردی کی تھی۔ اس نے اسے یہ بتانے بھی نہیں دیا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا۔ "ہاں میں نے بچے کو ضرور بھرشٹ کر دیا لیکن اس کے لیے میں مجبور تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے چھونے سے وہ بھرشٹ ہو جائے گا مگر بغیر چھوئے اسے اٹھانا ناممکن تھا۔ وہ بے چارہ بچہ تو بالکل سکتے میں تھا۔ اور اس کی ماں نے مجھے گالی دی۔ جہاں بھی میں جاتا ہوں مجھے گالی اور نفرت ملتی ہے۔ "بھرشٹ بھرشٹ" میں سوائے بھرشٹ کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا۔ وہ سب کہتے ہیں "بھرشٹ ہو گیا" بھرشٹ ہو گیا۔" شاید اس کی ماں تو حق بجانب تھی۔ اس کے بیٹے کو چوٹ لگ گئی تھی۔ وہ تو کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔ یہ میرا قصور تھا اور دوسرے لڑکوں کا بھی۔ ہم نے وہ جھگڑا کیوں شروع کیا۔ یہ اس وجہ سے شروع ہوا کہ میں نے گول کر دیا تھا۔ مجھے گالیاں ملیں۔ بے چارہ بچہ! پرماتما کرے اسے زیادہ چوٹ نہ لگی ہو۔ اگر چھوٹا اسے کھلا لیتا تو وہ بے چارہ اس جگہ پر نہ کھڑا ہوتا اور پھر شاید اسے چوٹ بھی نہ لگتی۔ میں وہ لڑکے کہاں چلے گئے ہیں؟"

اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ تو اکیلا ہی چلتا رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سہ پہر کی زرد دھوپ میں بھنگیوں کی گلی میں صرف چڑیاں ہی اس طرح

چھپا رہی تھیں جیسے اس پر الزام لگا رہی ہوں۔ ایک ناقابلِ برداشت تھکاوٹ کے بوجھ سے وہ اچانک کانپ گیا اور اس نے اپنی باکی کو مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ اپنی بغل میں لیے چل رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے راستے پر مڑ گیا جو اخروٹ کے سڑے ہوئے پتوں میں سے ہوتا ہوا اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کا گھر نظر آنے لگے وہ رک گیا اور ایک ایسی آسان اور محفوظ جگہ ڈھونڈنے لگا جہاں وہ اپنی باکی چھپا سکتا تھا۔ وہ اسے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کا باپ آگ بگولہ ہو جائے گا کہ وہ اپنا قیمتی وقت کھیلنے میں ضائع کرتا ہے جبکہ ٹٹیوں پر اتنا کام کرنے کو تھا۔ اس راستے سے ہٹ کر جنگلی کانٹے دار جھاڑیوں کی ایک لمبی قطار رکھی۔ وہ ان کی طرف مڑ گیا۔ جھاڑیوں کے بیچ کافی ٹھیک کھوکھلی سی زمین تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر اس خالی جگہ پر پہنچ گیا اور اس نے باکی وہاں رکھ دی۔ پھر اس نے ایک جنگلی جھاڑی کے چپٹو کی شکل کے پتوں کو نیچے جھکایا اور ان سے باکی کو ڈھک دیا تاکہ دھوپ؛ وغیرہ سے باکی خراب نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل آیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی باکی رکھتے ہوئے دیکھ لے اور بعد میں آکر باکی نکال کر لے جائے۔

جب باکھا گھر لوٹا تو لاکھا اس کا باپ، ایک ٹوٹے ہوئے موڑھے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ ایک منٹ کے لیے تو لاکھا کو پتہ بھی نہیں لگا کہ اس کا بیٹا آ گیا تھا پھر اچانک وہ اپنے موڑھے سے اٹھا اور اس نے اپنا مکا باکھا کی طرف بہت غصے سے تانا اور چلا کر بولا۔

"سور کے بچے، کتے کی اولاد تو چکمہ دے کر دوڑ گیا۔ تو ساری دوپہر غائب رہا اور اب تجھے آنے کی سوجھی؟ حرام کے جنے کیا تو نواب بن گیا ہے کہ جب اتنا کام کرنے کو پڑا ہے تو تو آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے؟ سپاہی کب سے چلا رہے ہیں؟"

باکھا اپنے باپ کے سخت غصے کے باوجود خاموش رہا۔ اس کا دماغ ایک دوسرے کے بعد آج اس پر بیتے ہوئے واقعات کی یادوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ اسے اور کسی بات کا دھیان ہی نہیں تھا۔ وہ ضدی لڑکوں کی طرح چپ چاپ

کھڑا رہا اور اس کا باپ زہر اگلتا رہا۔

"سور کے بچے، تجھے اپنے بوڑھے باپ کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ تو صبح جاتا ہے اور رات کو گھر لوٹتا ہے۔ ٹٹیوں پر کام کون کرے گا؟ میں نے تیری پرورش کی۔ کیا تو بڑھاپے میں بھی مجھے آرام نہیں کرنے دے گا؟ تو صاحب بننے کی کوشش میں پھرتا رہتا ہے اور ہے تو ایک بھنگی کا بیٹا، حرامی، کتے، سور!"

گالیوں کی بوچھاڑ میں باکھا ٹٹیوں کی طرف بڑھا۔ وہ ایک جھاڑو اٹھانے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ جھاڑو تو اس کے بھائی راکھا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

"تو تو واپس آگیا!" راکھا ایسے بولا جیسے وہ راستی پر ہو۔ وہ بڑے بھائی کی طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں اپنے باپ کے لاڈلے ہونے کا فخر جھلک رہا تھا۔

باکھا جانتا تھا کہ لڑکا بن رہا تھا کیونکہ اس نے دوپہر کو کام کر کے باپ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اسے راکھا کی بدتمیزی پر اس سے نفرت نہیں ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ جب راکھا بچہ تھا تو وہ اس سے کتنا پیار کرتا تھا۔ اور وہ اس کی گستاخی اور باپ کی گالی بھی برداشت کر لیتا کیونکہ قصور اس کا تھا لیکن لڑکے نے اسے جھاڑو دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا باپ اسے پھٹکارتا رہا۔

"سور کا بچہ، حرامی۔ اس میں شرم نہیں رہی۔ کھیلنا، کھیلنا، کھیلنا اور سارے دن آوارہ گردی جیسے اس کے پاس کچھ کام ہی نہیں ہے۔"

باکھا کو محسوس ہوا کہ وہ بار بار اس دشنام طرازی کا دہرایا جانا برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اسی طریقے سے اسے پریشان کر دیتا تھا، ایک بات کو بغیر سانس لیے بار بار کہہ کر۔ وہ ٹٹیوں کی طرف چل پڑا۔

"دور ہو جا سور، میرے پاس سے دفع ہو جا" پیچھے سے اس کا باپ چلّایا "خبردار جو اس جھاڑو کو ہاتھ لگایا ورنہ میں تجھے زندہ گاڑ دوں گا۔ نکل جا میرے گھر سے اور جہاں تیری مرضی آئے چلا جا۔ خبردار اپنا منحوس چہرہ

ہمیں پھر دکھایا تو!"

اس سے پہلے باکھا نے اکثر اپنی مصیبت کو اپنی قسمت سمجھ کر سہہ لیا تھا۔ اس نے چپ چاپ اپنے باپ کی گالیوں، طعنوں اور کبھی کبھار مار تک کو بھی برداشت کر لیا تھا اور یہ اس کی شرافت اور فرمانبرداری کو ظاہر کرتا تھا۔ اس نے کبھی اپنا ہاتھ کسی کے خلاف بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے نہیں اٹھایا۔ لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اس کے جسم کے اندر دبی ہوئی چنگاری تو آج صبح ہی بھڑک اٹھی تھی اور وہ آگ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ تھوڑا سا اس میں تیل پڑا تو وہ ایک زبردست شعلے کی صورت میں بھڑک اٹھی۔

وہ بغیر پیچھے دیکھے تیزی سے دوڑتا ہوا میدان کو پار کر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شیطان اس پر سوار ہو گیا تھا۔ اسے اس چکنا چور کرنے والے لمحے کا احساس بھی نہیں تھا جس نے اس کے اندر یہ اڑان بھر دی تھی۔ نہ وہ اس نفرت کے احساس سے واقف تھا جو اس لمحے کو پُر کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر کے شیطان کے ہاتھ میں ایک بے رحم تلوار تھی جو راستے میں حائل ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی تھی اور اس قتل و غارت کی قوت سے اس نے ایک زیادہ ناپاک طاقت حاصل کر لی تھی جو اپنی شدّت میں بے حد خوفناک تھی۔ اس نے کسی بھوت پریت کی طرح باکھا کے جسم میں ایک غضب کی وحشت ناک قوت بھر دی تھی، اگرچہ باکھا کو اس پر اختیار بھی تھا۔

وہ بڑے اشتیاق سے آگے بڑھا۔ پرانی ندی اس کے دائیں طرف بے اطمینانی کے طوفانی سمندر کی مانند تھی جس کی پہاڑی لہروں کو تند ہوا بہائے لیے جا رہی تھی حتیٰ کہ چٹانیں اور بڑے بڑے پہاڑی پتھر آسمان کے پس منظر میں چاقو کے تیز پھل کی طرح نکیلے ہو گئے تھے یا زمین پر خاموشی سے لڑھک گئے تھے۔ اس کے بائیں طرف کا ماحول بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ اُبلنے والے گرد آلود میدان کا منظر، جس میں گلابی، چاندی کے رنگ کے اور سفید چھوٹے چھوٹے نقش و نگار بنے ہوتے تھے جہاں سورج کی کرنیں ان پر اور میدان کی اکڑی زمین اور پتھروں پر رقص کر رہی تھیں۔

جب وہ میدان کے سامنے، چپٹی زمین کی جھالر پر پہنچ گیا تو الٹے ہوئے آسمان کا گول گھیر اسے پہر کے سورج کے سفید رنگوں اور تہوں کو جذب کر رہا تھا

اور ایک قرمزی رنگ کی تہہ ساری دنیا کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ یہاں اس نے اپنی رفتار سست کر دی کیونکہ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے صبح سویرے کی دھوپ کی پہلی چمک کو اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس میدان کے بیچ میں سے ہوتا ہوا، جوش و خروش کا پتلا بنا، وہ باہر کی وسیع دنیا کی طرف روانہ ہوا تھا۔

یہ کھلی فضا خالی تھی سوائے اس نہ ختم ہونے والے آدمیوں کے سلسلے کے جو اپنے کچے گھروں میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ کچے گھر شمال میں کھمبیوں کی طرح ایک جھنڈ کی شکل میں موجود تھے۔ اور ان کے چاروں طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن میں ٹوٹی ہوئی بوتلیں، پرانے ٹین، مری ہوئی بلیاں، گندی مٹی میں لتھڑی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں دبی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو غصے کی حالت میں اتنا بلند محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ احساس ہوا کہ وہ ایک دیو تھا اور بلندیوں اور پستیوں کے تمام مناظر کو پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔

"کتنا خراب، کتنا خراب دن رہا۔ میں نے کیا کیا کہ میرے ساتھ ہی یہ سب کچھ گزرا۔" وہ انتہائی غصے میں چلایا۔

ٹٹیوں کی طرف جاتا ہوا ایک سپاہی گزرا۔ وہ ایک خندق میں کود گیا تاکہ وہ سپاہی اسے نہ دیکھ سکے۔ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سکون پانے کے لیے چپ چاپ اور خاموش رہنا چاہتا تھا۔ جب وہ سپاہی چلا گیا تو وہ خندق میں سے نکل آیا اور پیپل کے درخت کی طرف بڑھا جو میدان میں تھا اور جس کے چاروں طرف مٹی کا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس نے اس کے نیچے بیٹھ کر منہ سورج کی طرف کر لیا۔

اب باکھا نے اپنے آپ کو بالکل بے آسرا محسوس کیا اور اب اُس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ تو بے گھر ہے۔ اس طرح اسے پہلے کبھی گھر سے نکالا جا چکا تھا۔ دراصل جب کبھی اس کا باپ ناراض ہوتا تھا تو وہ اسے اور اس کے بھائی کو گھر سے نکالنے کی ہی دھمکی دیتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی ماں کی موت کے بعد ایک دفعہ اس کے باپ نے ساری رات اسے گھر سے باہر کر کے

دروازے پر تالہ لگا دیا تھا کیونکہ باکھا نے گھر کی دیکھ بھال ٹھیک طرح نہیں کی تھی۔
وہ جاڑے کی رات تھی۔ پورب کی ہوا چل رہی تھی اور اسے نیند آ رہی تھی۔ وہ دن بھر کے کام سے تھک گیا تھا اور اس نے جماہی لی۔ ساتھ ہی وہ دو گوڑے کی ٹوکریوں کے پیچھے اپنے اوور کوٹ میں سکڑ کر لیٹ گیا۔ اگلے روز اس نے انتہائی غیر ذمے داری اور ظلم کا شکار ہو کر کتنی تکلیف اٹھائی تھی! کیا یہ وہی باپ ہو سکتا تھا جس نے اپنے ہی کہنے کے مطابق ڈاکٹر سے اس کے لیے گڑگڑا کر دوا مانگی تھی؟ باکھا کو یاد تھا کہ اس واقعے کے کئی دن بعد تک وہ اپنے باپ سے نہیں بولا تھا۔ اس وقت سماج میں اپنی گری ہوئی حالت کے لیے اس کے دکھ میں بغاوت اور تشدّد کے عناصر بڑے کم ہو گئے تھے۔ اس نے سخت محنت شروع کر دی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ یہ سزا اس کے لیے ٹھیک تھی کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سے اس نے اپنے کام میں جی لگانا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے فرشوں کو رگڑ کر صاف کرنا، روٹی بنانا اور پانی لانا سیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ٹٹیوں کو صاف بھی کرتا تھا اور کھاد کو کھیتوں میں ہاتھ کی گاڑی میں بھر کر بھی لے جاتا تھا۔ باوجود اس بات کے کہ اسے کھانے پینے کو زیادہ نہیں ملتا تھا، وہ ایک بڑا اور مضبوط آدمی بن گیا تھا اور اس کے کندھے چوڑے، اور کولہے موٹے تھے اور بازوؤں میں مچھلیاں ابھر آئی تھیں۔ یعنی وہ ایک ہندوستانی پہلوان کی خصوصیتوں کے اتنا قریب تھا جتنا اسے ہونے کی خواہش تھی۔

لیکن یہ اس کی موجودہ بے عزتی! اس نے تو اسے خراب کر دیا تھا، اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا کہ اسے یہ سزا ملتی۔ اگر اس نے تمام زندگی میں آدھے دن کی چھٹی بھی کر لی تو اس کے باپ کو اس پر اتنی سختی کرنے کا کیا حق تھا، خاص طور پر جب کہ اسے پتہ تھا کہ آج شہر میں اس کی بے عزتی ہوئی تھی اور اس کا کام کرنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی دوپہر برباد بھی نہیں کی تھی۔ اس نے ایک نئی ہاکی حاصل کی تھی۔ لیکن شاید یہ ایک بات ایسی تھی جو اس کے باپ کو کبھی اچھی نہ لگتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہاکی کھیلے اور اسی لیے یہ سب جھگڑا ہوا۔

"راکھا نے ضرور میری چغلی کھائی ہوگی" وہ بڑبڑایا، "کیونکہ وہ باہر کھیلنے نہیں جاسکا۔
میرا دن کتنا برا گزرا، بڑا منحوس اور بدقسمتی کا دن۔ کاش مجھے موت آجاتی" وہ مایوسی
کے گہرے سمندر میں ڈوب کر اور اپنا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح
اپنا سر ہاتھوں میں پکڑے بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس خیال سے
کہ اس کا کوئی گھر اور باپ نہیں تھا بڑا بے زار اور گھٹا گھٹا سا محسوس کیا۔ اس نے
غیر شعوری طور پر بیٹھنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں چھوٹا، رام چرن
یا نچلی ذات کی بستی کا کوئی بھی آدمی اسے دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔ جوں جوں وقت
گزرتا گیا اسے اپنے اردگرد کے خالی پن کا احساس ہوتا گیا اور سوچنے لگا کہ شاید
وہ ہمدردی جس کی اسے ضرورت تھی، کبھی نہیں آئے گی۔

لیکن وہ غلطی پر تھا کرنل ہچنسن جو مقامی سالویشن آرمی (مکتی فوج) کا
چیف تھا کبھی بھی نچلی ذات کی بستیوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ اپنی غیر مذہب
پرست بیوی سے وہ ہمیشہ یہ بہانہ بنا دیتا تھا کہ وہ پہاڑیوں کی طرف سیر کرنے
جا رہا تھا جہاں بہشت کی بادشاہت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دراصل وہ
یسوع مسیح کے لیے اِن گندی بستیوں میں گھوما کرتا تھا اور کوڑے کے ڈھیروں
کے بیچ میں سے اچھوتوں سے خدا اور یسوع مسیح کی باتیں کرتا تھا۔ اگر انھیں
تبلیغ اور عیسائیت کے فروغ میں خاطر خواہ نتیجے حاصل کرنے تھے تو سالویشن
آرمی کو دیسی لوگوں کا سا لباس پہننا ہوگا اور اُن میں رہنا ہوگا اور اس نے اپنی
کرنل کی وردی کا ڈیزائن جو وہ پہنتا تھا، خود بنایا تھا۔ سفید پتلون، سرخ رنگ
کی جیکٹ اور سفید پگڑی جس کے اوپر ایک لال پٹی بندھی ہوتی۔ کرنل اب اگر
یوجین سینڈو کی ہوبہو تصویر نہیں تھا تو وہ کسی زمانے میں بڑا مضبوط آدمی
ضرور رہا ہوگا۔ پرانے زمانے میں اس کے سر پر بہت بال تھے۔ اب بدقسمتی سے
وہ گنجا تھا اور اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ اس کے بال گرم پگڑی پہننے کی وجہ سے
اُڑے تھے اور اس لیے بھی کہ وہ پڑھتا بہت تھا۔ اس نے ایک دفعہ اصلی کرنل کی
طرح اوپر کی طرف مڑی مونچھیں بھی رکھی ہوئی تھیں جو کافی سخت، گھنی اور کالی تھیں۔
وہ سخت اور گھنی تو اب بھی تھیں لیکن سفید اور جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی متعصب

بیوی ہار کر یہ الزام لگاتی کہ کرنل کے ہاتھوں میں عیسائیت کے پرچار کا کام بالکل ناکام رہا تھا کیونکہ پچھلے بیس سالوں میں پانچ سے زیادہ آدمیوں نے عیسائی دھرم قبول نہیں کیا تھا اور وہ پانچ بھی کالے اور گندے اچھوت تھے۔ لیکن کرنل کی مونچھوں کے ساتھ انصاف کی رو سے یہ کہنا پڑے گا کہ اس کی بیوی بڑی بدطینت تھی اور اسے کرنل سے ذاتی شکوہ تھا۔ وہ اس کی طرف شروع میں اس لیے کھنچ گئی تھی کیونکہ کرنل جوانی میں بہت عمدہ شباہت اور اعلیٰ جسمانی خصوصیتوں کا مالک تھا اور اس کی سیاہ مونچھیں خاص طور پر پُرکشش تھیں۔ وہ کیمبرج کی مَیس میں بار پر ایک ویٹر تھی اور اسے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے شراب کے قطرے جو شراب پینے کے بعد کرنل کی مونچھوں میں پھنسے رہتے تھے بڑے اچھے لگتے تھے۔ اس نے اس کشش سے بے بس ہو کر کرنل سے شادی کر لی تھی لیکن ہندستان سے وہ ناراض تھی۔ وہ نہ صرف گھر میں، کالے، نوکروں سے نفرت کرتی تھی بلکہ اسے یہ بھی پتہ لگا کہ اس کا شوہر اس کے دل کھول کر تاش کھیلنے، شراب پینے اور جنسی اختلاط کے طور طریقوں کے مقابلے میں، کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور محتاط تھا۔ پھر بھی اس نے وہسکی کی طاقت پر بہت سالوں تک برداشت کیا تھا۔ پھر کرنل کی مونچھیں سفید ہو گئی تھیں اور عمر کے بوجھ سے نیچے کی طرف جھکنے لگی تھیں۔ کرنل اب پینسٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی کے کہنے سننے کے باوجود، یہ بات کہنی پڑے گی، کہ کرنل ہچنسن کی اپنے کام اور مقصد میں لگن، جس کا اس نے عہد لیا تھا، اور اس سے وفاداری قابلِ تعریف تھی۔ پینسٹھ سال کی عمر میں وہ بلا کا چست تھا اور وہ ہمیشہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گندگی میں گھات میں بیٹھا رہتا کہ شاید کوئی مصیبت زدہ چوڑھا، چمار، جو تھکا ہوا اور بھوکا ہو ادھر نکل آئے اور اپنی بدحالی میں عیسیٰ مسیح کا پیغام سن لے۔ وہ ہمیشہ ہندستانی میں ترجمہ کی ہوئی بائبل کی کچھ کاپیاں اپنے ساتھ اپنی بغل میں رکھتا تھا اور سینٹ لُیوک کے پیغام کی بے شمار کاپیاں وہ اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں بھر لیتا تھا اور کوئی بھی راہ گیر آ تا تو اس کے ہاتھوں میں چاہے وہ رضا مند ہوتا یا نہیں، ایک تھما دیتا۔ کرنل ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا، قابلِ رحم حد تک کمزور، اور اپنی

چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا رہتا تھا۔ لیکن اس کی زبان کی نوک ایک قینچی کی طرح تھی جو ہندوستانی بولی کے لب ولہجے کی دھجیاں اڑا دیتی تھی جیسے کوئی طوطا اپنی چونچ سے اپنی خوراک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اس کام کو دیکھتے ہوئے جو وہ کالے لوگوں میں کرتا تھا' یہ ایک جذبہ ہی تھا جس نے اسے ہندوستانی سیکھنے پر اکسایا تھا۔ ہاں زبان کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی عادت اور اسے اپنے ہندوستان میں تیس سال کے قیام میں بھی ٹھیک طرح نہ بول سکنا' اپنے نتائج میں تباہ کن بھی تھا۔

"تم اداس ؟" کرنل نے اپنا ہاتھ باکھا کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

بھنگی کا لڑکا اس آدمی کو جسے وہ انگریز سمجھتا تھا ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ وہ تو یہ امید کر رہا تھا کہ شاید چھوٹا اور رام چرن آجائیں اور اسے تسلی دیں یا کوئی دوسرا نچلی ذات کی بستیوں میں سے آجائے۔ اس کو تو یہ دھندلا سا بھی خیال نہیں تھا کہ کرنل ہچنسن یہیں آجائے گا اور یوں اچانک۔ اگرچہ وہ کالے لوگوں سے آزادی سے ملتا تھا اور اس میں وہ زیادہ برتر کھنچے کھنچے اور پہنچ سے باہر انگریزوں جیسی کشش نہیں تھی مگر پھر بھی وہ صاحب تو تھا اور پتلون پہنتا تھا اور کموڈ استعمال کرتا تھا۔ باکھا کو محسوس ہوا کہ صاحب نے اس سے ہندوستانی میں بات کر کے اسے عزت بخشی تھی' چاہے وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اہم محسوس کیا کیونکہ ایک صاحب اس سے ہمدردی ظاہر کر رہا تھا اور اس پر رحم کھا رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے فوراً کرنل کو پہچان لیا تھا۔ یہ بات نہیں کی تھی کہ پادری کو کوئی نہیں جانتا تھا مگر یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُن کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ سنجیدہ مزاج ہونے کی وجہ سے اور اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے اس نے ہچنسن سے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی اگرچہ کرنل اس کے باپ کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ بچہ تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کا باپ بھی اس صاحب کی بات کرتا تھا۔ بعض اوقات جب وہ اسے دور سے دیکھ لیتا تھا تو بتاتا تھا کہ بوڑھا صاحب چاہتا تھا کہ یسوع مسیح

کے مذہب کو وہ اختیار کرے کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ سب بھی صاحب بن جائیں مگر اس کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ جو دھرم میرے بزرگوں کے لیے اچھا تھا، میرے لیے بھی اچھا تھا اور میں اپنے دھرم کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

"سلام صاحب" باکھا اٹھتے ہوئے اور اپنا ہاتھ پیشانی تک اٹھاکر بولا۔

"سلام سلام۔ تُم بیٹھا رہو۔ اپنے کو تکلیف نا دیئں دو" کرنل نے غلط سلط ہندوستانی میں باکھا سے پیار اور ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

کرنل کی اس بہادرانہ کوشش میں کتنی عمدہ بات تھی کہ وہ ایک غیر قدرتی ماحول کو قدرتی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں خودی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس نے اپنی ہر بڑی بات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا، اپنی پیدائش کے فخر کو، اپنی نسل اور رنگ کو، اور کالے لوگوں کے رسم و رواج کو اپنا لیا اور ان کے طور و اطوار کو پسند کرتا تھا۔ یہ سب کچھ بلاشبہ اس لیے تھا کہ ہندوستان میں سالویشن آرمی مضبوط ہو جائے۔ اس نے اپنے اونچے طبقے کے انگریز ہونے کی نمایاں حیثیت کو عیسائی جذبات کی بنا پر دبا دیا تھا اور اپنے کردار کی تنگ اور متعصب قوم پرستی پر سفید پوش جذبۂ انسانیت کا ملمع چڑھا دیا تھا۔

"تُم کے ساتھ کیا بات ہوا؛ تُم بیمار ہوتا ہے؟" کرنل نے جھکتے ہوئے پوچھا

باکھا گھبرا سا گیا اور مہربانی کے اس ریلے سے وہ الجھن میں پڑ گیا "چرن سنگھ" اس نے سوچا "آج مجھ پر مہربان تھا لیکن صاحب تو سراپا سخاوت ہے۔" اسے خیال ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا لیکن کرنل کی اصل صورت اس کے سامنے تھی۔ اور کیا اس نے کرنل کی چوں چوں کرتی عجیب سی آواز ہندوستانی بولتے نہیں سنی تھی؟ اور ہندوستانی بھی کافی اچھی، باکھا نے سوچا، اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ ایک صاحب بول رہا تھا۔ جہاں تک وہ جانتا تھا صاحب لوگ ہندوستانی نہیں بولتے تھے۔ وہ صرف کچھ روزمرہ کے استعمال کے

الفاظ یا گالی کے الفاظ جانتے تھے جیسے "اچّا (اچھا)"، "جاؤ"، "جلدی کرو"، "سور کا بچّہ"، "کتّے کا بچّہ" وغیرہ وغیرہ۔

"کچھ نہیں صاحب، تھوڑا سا تھک گیا ہوں" باکھا شرما کر بولا "میں بھنگی ہوں، لاکھا کا بیٹا جو بھنگیوں کا جمعدار ہے۔"

"ہم جانتا ہے۔ تمہارا باپ کا حال چال کیسا ہوتا ہے؟"

"حضور وہ بالکل ٹھیک ہے۔" باکھا بولا۔

"تمہارا باپ تُم کو بولا ہم کون ہے؟" کرنل نے ایک انگریز کے عملی نظریے کو اپناتے ہوئے فوراً مقصد پر آتے ہوئے کہا۔

"ہاں حضور آپ صاحب ہیں۔"

"نائیں نائیں۔" کرنل بن کر بولا۔ "ہم صاحب نہیں ہے۔ ہم تمہارا مافق ہے۔ ہم مُکتی فوج کا پادری ہے۔"

"ہاں صاحب میں جانتا ہوں" باکھا نے کہا۔ وہ اِس باریک امتیاز کو نہیں سمجھ سکا جو کرنل اپنے اور ہندوستان میں عام صاحبوں کے درمیان پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے عیسائی ذہن کے مطابق وہ صاحب سرپھرے اور واہیات قسم کے آدمی تھے اور یہ ایک شرمناک بات تھی۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے علیحدہ بتانا چاہتا تھا مبادا ان کی بُری حرکتیں غیر عیسائی لوگوں کے لیے اس کے مفاد اور اس کے ارادوں کی صداقت پر برا اثر ڈالیں لیکن باکھا کے لیے تو سارے صاحب ہی تھے، پتلون اور ہیٹ پہنے ہوئے جو حد سے زیادہ سخی تھے اور اپنے پرانے کپڑے اپنے نوکروں کو دے دیتے تھے۔ لیکن تھوڑے سے بدمزاج بھی تھے اور اپنے نوکروں کو بہت گالی دیتے تھے۔ باکھا کو یہ ضرور پتہ تھا کہ کرنل ایک پادری صاحب تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پادری کرتا کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ گرجا گھر کے پاس رہتا تھا اور بھنگیوں کی بستی میں آتا رہتا تھا۔ اس کے لیے پادری بھی بڑے پرکشش تھے کیونکہ ان کا لباس بھی یوروپین لباس تھا۔ لیکن یہ پادری برٹش رجمنٹوں کے پادری والا ہیٹ نہیں پہنتا تھا۔ لیکن اِس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ باقی کے سارے کپڑے

دہی پہنتا تھا جو دوسرے صاحب پہنتے تھے۔ وہ واقعی صاحب تھا اور اسی صاحب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی تھی اور اس سے مہربانی کے الفاظ بولے تھے بلکہ یہاں تک پوچھا تھا کہ وہ اداس کیوں نظر آرہا تھا۔ وہ تو کسی صاحب سے اتنے شاندار سلوک کے لیے رو تک سکتا تھا اور بہ عمدہ اور نایاب صفات صاحب لوگوں میں ہوتی ہیں ان کے ساتھ اپنی وابستگی پر وہ خوشی سے چیخ بھی سکتا تھا۔ تاہم، ان تمام باتوں کے باوجود وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکا کہ کرنل کس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم ایک پادری ہے اور میرا ایشور یسوع مسیح ہے۔" کرنل نے زور دیا۔ "تُم تکلیف میں ہے تو یسوع مسیح کے پاس گرجا گھر میں آؤ۔" وہ بے کار میں اس وعدے کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔ "سب لوگ جو محنت کرتا ہے، اُدھر آئے۔ میں اُن کو آرام دے گا۔"

باکھا اس اتفاق سے بڑا متاثر ہوا۔ پادری کو کیسے پتہ لگ گیا کہ وہ تکلیف میں تھا؟ "اور یسوع مسیح کون تھا جس کے مذہب کو میرے باپ نے بتایا تھا کہ یہ پادری چاہتا تھا کہ ہم اختیار کرلیں۔ کیا وہ گرجا گھر میں رہتا تھا؟" اسے یاد آیا کہ جب کبھی وہ گرجا گھر سے گزرتا تھا تو اسے وہ بڑا پراسرار نظر آتا تھا۔

"صاحب یسوع مسیح کون ہے؟" باکھا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا اور بڑے تجسس سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہمارا ساتھ آؤ، ہم بتائے گا۔" کرنل ہچنسن بولا "گرجا گھر میں آؤ۔" اور لڑکے کو اپنے بازو سے پکڑ کر وہ اسے لے چلا۔ وہ کچھ بولتا سا جا رہا تھا، مہمل اور بے معنی۔ وہ کسی بادل کی طرح سبک قدم تھا اور کسی درویش کی طرح صابر، وہ لڑکے کو یہ گیت سناتا ہوا لے گیا۔

"زندگی جیسس میں ملتی ہے
صرف وہیں یہ تجھے پیش کی جاتی ہے
اس کی کوئی قیمت، کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا

یہ ایشور کا تحفہ ہے جو مفت بھیجا جاتا ہے۔"

باکھا تو تعجب کے مارے گونگا سا ہوگیا۔ وہ تذبذب کے عالم میں ڈوب گیا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بڑا خوش بھی محسوس کر رہا تھا اور اِس بلاوے پر عزت افزائی محسوس کر رہا تھا کیونکہ یہ صاحب کی طرف سے تھا چاہے اپنے سلوک میں وہ ہندوستانی لوگوں کی طرح ہی تھا۔ وہ خوشی سے کرنل کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ اس کا ہر لفظ توجہ سے سن رہا تھا اگرچہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"زندگی صرف مسیح میں ملتی ہے"

کرنل نے پھر گایا۔ وہ اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا اور اِسے اِس کا احساس بھی نہیں تھا کہ اِس وقت ایک مصیبت زدہ آتما اس کی سپردگی میں تھی۔

جیس، جیس کون تھا؟ کیا یسوع مسیح اور جیس ایک ہی تھے؟ صاحب کہتا ہے وہ ایشور ہے۔ کیا وہ ہندوؤں کے ایشور رام کی طرح کا ایشور تھا؟ رام کی پوجا تو اس کا باپ بھی کرتا تھا اور اس کے بزرگ کرتے تھے اور جس کا ذکر اس کی ماں اپنی پوجا میں بھی کرتی تھی۔ یہ خیالات کسی بڑے تیز تند طوفان کی طرح اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے اور وہ اِن سے پھٹ پڑ سکتا تھا، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کرنل اپنے بھجن میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔

"زندگی صرف جیس میں ملتی ہے
صرف وہیں تجھے یہ پیش کی جاتی ہے
اس کی کوئی قیمت، کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا
یہ ایشور کا تحفہ ہے جو مفت بھیجا جاتا ہے۔"

"حضور!" باکھا نے بے صبری سے کہا، جب کرنل نے یہ گیت تیسری دفعہ ختم کیا، "جیس کون ہے؟ وہی جو یسوع مسیح ہے؟ کون ہے وہ؟"

"وہ مرا تاکہ ہمیں معافی مل جائے
وہ مرا، ہمیں نیک بنانے کے لیے
تاکہ ہم کم سے کم بہشت میں تو چلے جائیں
اس کے قیمتی خون کی بدولت"

کرنل نے جلدی سے گا کر جواب دیا، اس سے پہلے کہ باکھا کو پتہ لگے کہ اس نے پوچھا کیا تھا۔ لیکن اس جواب سے بھی اسے کچھ نہیں پتہ لگا تھا۔ یہ جواب، اگر یہ جواب تھا، تو اس کے لیے معمّہ تھا۔ الفاظ اور مزید الفاظ! وہ کچھ گھبرا سا گیا اور اس نے ایک بے اطمینانی کا احساس کیا۔ لیکن وہ صاحب کے ساتھ چلتا ہوا اتنا خوش تھا کہ اس نے سب کچھ برداشت کرلیا اور کرنل کے گیت کے کچھ حصوں کو یاد کرنے لگا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ اِن کا کیا مطلب تھا۔ لیکن سوائے گھٹی گھٹی صداؤں کے اس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔

"صاحب یسوع مسیح کون ہے؟"

"وہ خدا یعنی ایشور کا بیٹا ہوتا ہے" کرنل نے ایک لمحے کے لیے اپنے تصورات کے آسمان سے دھرتی پر آتے ہوئے کہا۔ "وہ اِس لیے مرا تاکہ ہم لوگ کو معافی مل جائے۔"

اور پھر وہ گانے لگا۔

"وہ مرا تاکہ ہمیں معافی مل جائے
وہ مرا ہمیں نیک بنانے کے لیے
تاکہ ہم کم سے کم بہشت میں تو چلے جائیں
اس کے قیمتی خون کی بدولت"

"وہ مرا تاکہ ہمیں معافی مل جائے" باکھا نے سوچا۔ "اِس کا کیا مطلب ہے؟ وہ ایشور کا بیٹا ہے! کوئی آدمی ایشور کا بیٹا کیسے ہو سکتا تھا؟ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ ایشور تو آسمان میں رہتا ہے۔ اور ایشور کے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اس کا بیٹا مرا کیوں؟ ہمیں معافی دلوانے کے لیے؟ کس بات کی معافی دلوانے کے لیے؟ اور ایشور کا بیٹا ہے کون؟"

"صاحب یسوع مسیح کون ہے؟ کیا وہ صاحب لوگوں کا خدا ہے؟" باکھا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کہیں وہ گورے صاحب کو زیادہ سوالوں سے پریشان تو نہیں کر رہا تھا۔ اسے اپنے تجربے سے پتہ تھا کہ انگریز لوگ بہت زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتے۔

"وہ پرماتما کا بیٹا ہوتا، میرے بیٹے۔" کرنل نے اپنے سر کو ایک سرمستی میں گھما کر کہا "اور وہ مرا ہم لوگ کے لیے جو گناہ کرتا ہے۔"

"وہ مرا تاکہ ہمیں معافی مل جائے
وہ مرا ہمیں نیک بنانے کے لیے
تاکہ ہم کم سے کم بہشت میں تو چلے جائیں
اس کے قیمتی خون کی بدولت"

باکھا پادری کے بار بار بھجن گانے سے اکتا گیا۔ لیکن گورے صاحب نے اس سے بات کرنے کی زحمت کی تھی، اس کی طرف دھیان دیا تھا۔ وہ خوش تھا اور اسے فخر تھا کہ وہ صاحب کی صحبت میں تھا۔ اس لیے اس نے پادری کو خوشی سے برداشت کیا بلکہ اپنا سوال پھر کر دیا۔

"صاحب کیا گرجا گھر میں یسوع مسیح کی پوجا کرتے ہیں؟"

"ہاں ہاں" کرنل نے جواب دیا اور پھر ایک نیا بھجن گانا شروع کر دیا۔

"جیسس رحمدل چرواہے، میری سنو
میرے گناہوں کو بخشوا دو
روشنی ہونے دو
اور اپنی روشنی اس لڑکے کے دل میں بھر دو"

باکھا کو بڑا تعجب ہوا اور وہ تنگ آ گیا۔ ان بھجنوں میں سے کوئی بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ صاحب کے ساتھ چلا آیا تھا کیونکہ صاحب پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پتلون تو اس کی زندگی کا حسین خواب رہی تھی۔ اس ہمدردی سے متاثر ہو کر جو اس پتلون پہننے والے آدمی نے اس کے ساتھ اس کے انتہائی غم کے لمحے میں ظاہر کی تھی، اس نے اپنے ذہن میں اپنی تصویر بنا لی تھی جس میں وہ صاحب کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور صاحب ہی کی زبان بول رہا تھا۔ وہ تصویر آہستہ آہستہ ایک گارڈ کی تصویر بن گئی جسے اس نے اپنے گاؤں کے نزدیک کے ریلوے سٹیشن پر دیکھا تھا۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ یسوع مسیح کون تھا۔ شاید صاحب اسے عیسائی بنانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنا مذہب تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے اپنا مذہب بدلنے میں

اعتراض بھی کوئی نہیں تھا اگر اسے یہ پتہ لگ جاتا کہ یسوع مسیح کون تھا۔ لیکن صاحب تو بھجن پر بھجن گائے جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یسوع مسیح خدا کا بیٹا تھا۔ خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا تھا؟ خدا یا ایشور کون ہے؟ اگر خدا رام کی طرح ہے تو اس کا تو بیٹا نہیں ہے کیونکہ اس نے تو کبھی نہیں سنا کہ رام کے کوئی بیٹا تھا۔ یہ سارا معاملہ اتنا پیچیدہ تھا کہ اس نے صاحب سے چھٹکارا پانے کی سوچی، یہ جھوٹ بول کر اسے کام پر جانا تھا اور صاحب کے ساتھ اب اور چلنا مشکل تھا۔

کرنل نے دیکھا کہ باکھا کچھ پیچھے ہو گیا تھا اور یہ محسوس کر کے کہ اس کا نیا چیلہ دلچسپی کھو رہا تھا، اس نے ایک اعلیٰ مبلّغ کی ضد کے ساتھ لڑکے کی بانہہ پکڑ لی اور بولا۔ "یسوع مسیح خدا کا بیٹا ہے، میرے بیٹے۔ ہم گناہ گار تھے اور ہماری خاطر وہ مرا ہے۔ اس نے ہمارے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔" پھر وہ ایک دفعہ اور بھگتی کے گانوں میں کھو گیا۔

"او کالواری! او کالواری!
جیسس تو میری خاطر مرا تھا
کالواری کی صلیب پر!"

اس نے اپنے آپ کو ہمارے لیے قربان کر دیا، باکھا نے سوچا۔ قربانی کا اس کا اپنا تصور بڑا واضح اور یقینی تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب کوئی تباہی اس کے گھر والوں پر آن ہوتی، جیسے کوئی بھیانک بیماری، یا قحط اور بھکمری تو اس کی ماں کسی بکری یا کسی اور جانور کی قربانی کر کے کالی کے مندر میں بھینٹ چڑھوایا کرتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس قربانی سے دیوی دیوتاؤں کی ناراضگی دور ہو جاتی ہے اور وہ بپتا ٹل جاتی۔ اب یسوع مسیح کی قربانی کا کیا مطلب تھا؟ اس نے اپنے آپ کو کیوں قربان کر دیا؟

"حضور یسوع مسیح نے اپنے آپ کو کیوں قربان کر دیا؟" اس نے پوچھا

"وہ مرا تاکہ ہمیں معافی مل جائے
وہ مرا ہمیں نیک بنانے کے لیے
تاکہ ہمیں کم سے کم بہشت تو مل جائے

اس کے قیمتی خون کی بدولت"

کرنل نے جواب دیا، یہ بھول کر، جیسا کہ وہ اب تک کرتا رہا تھا کہ باکھا کو تو اس کے گیت کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر ہوشمندی کے چند لمحوں میں اس نے لڑکے کے چہرے پر فکرمندانہ خیالات کو صاف پڑھ لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بہت زیادہ بولتا رہا تھا اور زیادہ تر اپنے آپ سے۔

"اس نے اپنا آپ کو، ہم لوگ کا، سب کا محبت کا واسطے قربان کیا" وہ بولا "ہمارا سب کا مدد کے واسطے اپنا قربانی دیا، غریب کا واسطے بھی اور امیر کا واسطے بھی۔ برہمن کا واسطے بھی اور بھنگی کا واسطے بھی۔"

آخری فقرہ باکھا کی سمجھ میں آگیا۔ "اس نے اپنے آپ کو ہمارے لیے قربان کیا" وہ سوچنے لگا "امیروں کے لیے اور غریبوں کے لیے، برہمن کے لیے اور بھنگی کے لیے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی نظروں میں امیر اور غریب کے لیے کوئی بھی فرق نہیں تھا، نہ برہمنوں میں، نہ بھنگیوں میں یعنی مثال کے طور پر صبح والے پنڈت اور میرے بیچ میں بھی کوئی فرق نہیں۔"

"ہاں ہاں صاحب، میں سمجھ گیا" اس نے بڑے اشتیاق سے کہا "یسوع مسیح برہمن اور بھنگی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔"

"ہاں ہاں میرے بچے۔ جس کی نظر میں ہم سب لوگ ایک ہے۔" کرنل بولا اور پھر اپنی آواز میں گونج پیدا کرتے ہوئے وضاحت کی۔ "وہ ہم سے زیادہ اچھا اور بڑا ہے۔ وہ ایشور کا بیٹا ہے۔ ہم سب گناہ کرتا ہے۔ وہ ہماری طرف سے خدا سے، جو اس کا باپ ہے، ہمارا گناہ معاف کر دے گا۔"

"وہ ہم سب سے اچھا اور بڑا ہے۔ ہم سب گناہ گار ہیں۔ کیوں؟ کیوں کوئی دوسرا آدمی سب سے اچھا اور بڑا ہوتا ہے؟ ہم سب گناہ گار کیوں ہیں؟" باکھا سوچنے لگا۔

"صاحب ہم سب کیوں گناہ گار ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہم لوگ تو پیدائش سے ہی گناہ گار ہے" کرنل نے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔ اسے اس وقت آدم اور حوا کی ابتدائی گناہ کی کہانی سنانی تھی جس کی ضرورت

تھی لیکن پادری قدامت پسند تھا اور شرما گیا۔
"ہم سب لوگ کو اپنا گناہ ضرور ماننا ہے۔ اس کے بعد وہ ہم کو معافی دلائے گا۔ ورنہ سب لوگ کو دوزخ کا آگ میں جلنا ہوگا۔ تُم اپنا گناہ ہمارے سامنے مانے گا تو ہم تُم کو عیسائی بنا سکتا ہے۔"
"لیکن حضور میں تو نہیں جانتا کہ یسوع مسیح کون ہے میں تو رام کو جانتا ہوں، یسوع مسیح کو نہیں جانتا۔"
"رام تو بُت پوجنے والوں کا خدا ہوتا ہے" کرنل نے کہا اور کچھ وقفے کے بعد قدرے غیر حاضر دماغ سے بولا "آؤ اور اپنے گناہ میرا سامنے قبول کرو۔ اور جب تُم مرے گا تو یسوع مسیح تُم کو جنت کا دروازہ پر لینے آئے گا۔"
اب تو باکھا بڑا تنگ آ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایک صاحب اس کی صحبت میں تھا تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو اپنے مذہب کو تبدیل کرنے کے خیال سے ہی نفرت کرتا تھا۔ جو کچھ یہ کرنل کہہ رہا تھا وہ اسے زیادہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے یہ بات بھی پسند نہیں کی کہ وہ گناہ گار تھا۔ جہاں تک وہ یاد کر سکتا تھا اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ اپنے گناہ کیسے تسلیم کر سکتا تھا؟ کتنی عجیب تھی یہ بات! اور گناہ کو قبول کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا؟ کہیں صاحب اس سے کوئی پوشیدہ راز تو حاصل کرنا نہیں چاہتا، اس نے حیرانی سے سوچا۔ "کیا وہ کوئی چمتکار دکھانے والا ہے؟ یا مجھ سے کسی غیر قانونی بات کا پتہ کرنا چاہتا ہے؟ میں تو بہشت میں جانا بھی نہیں چاہتا۔" وہ چونکہ ہندو تھا اس لیے روزِ محشر میں بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے لوگوں کو مرتے دیکھا تھا اور وہ موت کی حقیقت کو مانتا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جو لوگ مرتے ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ اسے بڑا ڈر لگتا تھا کہ کہیں اگلے جنم میں وہ گدھا یا کتا نہ بن جائے۔ لیکن ان تمام باتوں سے وہ پریشان نہیں ہوا۔ "یسوع مسیح ضرور ایک اچھا آدمی ہوگا" اس نے سوچا، "اگر وہ ایک برہمن اور بھنگی کو ایک ہی سمجھتا ہے۔" لیکن وہ تھا کون اور کہاں کا رہنے والا تھا؟ وہ کرتا کیا تھا؟ اس نے رام کی کہانی تو سن رکھی

تھی۔ اس نے کرشن کی کہانی بھی سن رکھی تھی۔ لیکن یسوع مسیح کی کہانی اس نے نہیں سنی تھی۔" یہ صاحب مجھے یہ کہانی بتاتا نہیں ہے" وہ اپنے آپ سے بولا۔ لیکن اسے پھر بھی یہ امید تو تھی کہ شاید یہ صاحب اسے اپنی کوئی پرانی پتلون تو دے دے۔ اور وہ نیم رضامندی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

" دیکھو وہ ہمارا گھر ہے"۔ کرنل نے ایک احاطے کے گیٹ پر پہنچ کر کہا جس کا راستہ نیم کے درختوں میں پھیلے ہوئے کچے گھروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتا تھا جن کی پھوس کی چھتیں آگے کو جھکی ہوئی تھیں۔

" میں جانتا ہوں صاحب"۔ باکھا بولا کیونکہ وہ اکثر ادھر سے گزرتا تھا "کسی زمانے میں یہ نشہ گھر ہوتا تھا۔ یہاں افیم بنتا تھا"۔ کرنل نے فخریہ لہجے میں کہا " لیکن پانچ سال پہلے ہم اس کو لے لیا"۔ وہ ایک منٹ کے لیے رکا اور اس نے اس مصیبت کو یاد کیا جو اسے اس زمین کے ٹکڑے کو حاصل کرنے اور اس پر عمارت بنانے میں پیش آئی تھی اور وہ اچانک بڑی پاکیزگی سے یسوع مسیح کی شکر گزاری میں بول اٹھا " او مالک! او ایشور تیرا کارنامے کتنا عظیم ہے۔ تیرا خیالات کتنا گہرا ہے۔ خدا حقیقت میں اس دنیا میں روشنی لایا ہے"۔ پھر اپنے خیالات کو نوجوان لڑکے کی طرف موڑتے ہوئے اس نے کہا " اس نے کافر لوگوں کو اِس جگہ سے نکال ڈالا ہے"۔

احاطے کے عین بیچ میں ایک لمبے کچے گھر میں سے، گھٹی گھٹی سی آواز میں ایک گیت ابھرا۔ باکھا جانتا تھا کہ یہ گرجا گھر کی عمارت تھی۔ کرنل نے اس گیت کو نوجوان لڑکے کے فائدے کے لیے انگلی اٹھا کر اور گا کر ایک واضح شکل دے دی۔

" اپنی برکتوں کو بانٹو، اپنی برکتوں کو بانٹو
ہر روز بانٹو
اپنی برکتوں کو زندگی بھر بانٹو
اپنی برکتیں بانٹو چاہے وہ ایک ہی ہو
اور تم حیران ہو جاؤ گے کہ تم نے کتنا بھلا کیا ہے"۔

"جارج، جارج، چائے تیار ہے"۔ اندر سے ایک والہانہ، چیختی سی آواز آئی اور کرنل کے چوں چوں کرتے ہوئے گیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر گئی۔

"آتا ہوں، آتا ہوں"۔ کرنل نے وہیں کھڑے کھڑے خود بخود جواب دیا مگر اس کی ٹانگیں اور بازو تھرتھرا سے گئے۔ اس نے اپنی بیوی کی آواز سن لی تھی۔ وہ اس سے بڑا ڈرتا تھا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ دائیں طرف کے کچے گھر میں جائے جو اس کا بنگلہ تھا اور باکھا کو وہاں لے جائے یا باکھا کو لے کر گرجا گھر جائے۔ وہ اس پس و پیش میں ہچکچاتا ہوا کھڑا رہا۔

"تم کہاں ہو؟ ساری دوپہر کہاں گزاری؟" چیختی ہوئی آواز پھر آئی اور اس کے پیچھے ایک گول چہرے، کالے بالوں، پستہ قد اور متوسط عمر کی عورت نکلی جو ایک لمبے سگریٹ ہولڈر میں لگی ہوئی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے انگریزی طرز پر کٹے ہوئے بالوں پر ایک خوشنما رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پھیکی سی آنکھوں پر سبز تنگ دار عینک تھی۔ گردن سے نیچے تک کٹا ہوا، ایک چھپا ہوا سوتی فراک پہنے ہوئی تھی جو اس کے میک اپ کیے ہوئے چہرے سے مطابقت رکھتا تھا اور مشکل سے گھٹنوں تک آتا تھا۔

"اچھا تو یہ کام ہے جو تم کرتے رہتے ہو! ان کالے لوگوں کے پاس تم پھر گئے"، وہ غصے سے چلائی۔ اس کے خوب پاؤڈر ملے ہوئے چہرے کے نیچے سے اس کی اصلی، چقندر کی طرح سرخ کھال صاف نظر آرہی تھی۔ "میں تم کو چھوڑتی ہوں۔ تم واقعی ٹھیک ہونے والے آدمی نہیں ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ جس طریقے سے تم کو ان کانگرسی لوگوں نے پچھلے ہفتے مارا تھا اس سے تمہیں سبق مل گیا ہوگا"۔

"کیا بات ہو گئی، میں آتا ہوں، آرہا ہوں"۔ کرنل بولا۔ وہ بڑا پریشان اور الجھن میں تھا اور اسے بہت برا لگ رہا تھا۔

باکھا کرنل کو اس کی بیوی کے قہر سے بچانے کے لیے چپکے سے بھاگنے والا تھا کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ زیادہ تر وہ ہی اس کے غصے کے لیے ذمے دار تھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو"، کرنل نے بھنگی لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ہم تم کو گرجا گھر

ہیں رے جائے گا۔"

"ہاں تاکہ چائے ٹھنڈی ہو جائے"۔ میری ہجلنسی چیخ کر بولی "میں تمہارے واسطے سارا دن انتظار نہیں کر سکتی کہ تم ان تمام گندے بھنگی اور چمار لوگوں کے ساتھ الٹا سیدھا کر سکو۔" اور یہ کہہ کر وہ بھناتی ہوئی اپنے ذاتی کمرے میں گھس گئی۔

باکھا کو نہیں پتہ تھا کہ اس کے غصّے کی اصل وجہ کیا تھی لیکن جب اس کی زبان سے 'بھنگی' اور 'چمار' کے الفاظ سنے تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کی ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔

"سلام صاحب" اس نے اپنے ہاتھ بوڑھے آدمی کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ پادری کو اسی وقت احساس ہوا جب باکھا ہاتھ چھڑا چکا تھا۔ باکھا سرپٹ بھاگا۔ وہ اِس عورت سے بڑا خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو میرے بیٹے" پادری اس کے پیچھے پیچھے چلّایا۔

لیکن باکھا سہ پہر کے سورج کے سفید دھندلکے میں اور تیز دوڑنے لگا جیسے کہ کرنل کی بیوی کوئی جادوگرنی ہو جو ہاتھ اٹھا کر اپنے ٹیڑھے پاؤں سے اسے پریشان کرتی ہوئی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ بوڑھا آدمی باکھا کو غائب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی بھگتی سے ایک اور بھجن گانے لگا۔

"تیرے پیار کے صدقے، تیرے نام کے صدقے"

"ہر ایک آدمی ہمیں ہی قصوروار سمجھتا ہے" باکھا چلتے چلتے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا " وہ چاہتا ہے کہ میں آؤں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر لوں۔ اور اس کی میم صاحب! نہ معلوم اس نے بھنگیوں اور چماروں کے بارے میں کیا کہا۔ وہ صاحب سے ناراض تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میم صاحب کی ناراضگی کا سبب میں ہی تھا۔ میں نے تو پادری سے نہیں کہا تھا کہ آ کر مجھ سے بات کرے۔ وہ تو اپنے آپ آیا تھا۔ مجھے اس سے بات کر کے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ میں تو اس سے ایک پتلون ضرور مانگ لیتا اگر میم صاحب اس طرح ناراض نہ ہوتی۔"

وہ اپنی یادوں کے بوجھ سے دبا ہوا اور سنایا ہوا یونہی چلتا رہا۔ اسے پیٹ

میں کچھ گڑبڑسی محسوس ہوئی اور اس کا جی متلانے لگا۔ یہ ایک قسم کی روحانی تکلیف تھی جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ مصیبت میں ہوتا ہے۔ وہ پھر گھبرانے لگا جیسا کہ صبح وہ اپنے خراب تجربات کے بعد محسوس کررہا تھا۔ لیکن اب وہ اتنا تھک گیا تھا کہ اس نے اس کی پروا بھی نہیں کی۔ اس کی ٹانگیں اسے ایک بے خودی کے سے عالم میں، دن کے آخری سرے کی طرف جہاں چاہیں لے جارہی تھیں۔ نمی کی ایک ہلکی سی بو گرد آلود زمین سے آرہی تھیں جس پر وہ چل رہا تھا۔ ایک تر گرمی اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ بلا شاہ کی وادیوں سے کافی دور افق کے بہت اوپر سورج نیزے کی طرح اٹکا ہوا تھا اور بغیر تحلیل ہوئے ساکت سا تھا جیسے ڈوبنے کے لیے تیار نہ ہو اور گھلنا اور حرکت کرنا بھی نہ چاہتا ہو۔ البتہ پہاڑیوں اور کھیتوں میں ایک عجیب و غریب سی زندگی متحرک تھی۔ ٹھنڈے نیلے آسمان میں پرندوں کی لمبی ڈاریں اپنے گھروں کی طرف اڑان بھر رہی تھیں۔ بنڈے اور جھنگیر آواز کی کانپتی ہوئی برقی لہریں ٹھنڈی صاف ہوائیں بکھیر رہے تھے۔ راستے میں جس پر باکھا چل رہا تھا، گھاس کی پتی پتی روشنی سے چمک رہی تھی۔

وہ اپنے بھاری کولھوں سے، آہستہ آہستہ، سر جھکائے نیم وا آنکھوں سے، نچلا ہونٹ آگے کو کیے، چلا جارہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ وہ ایک تھکی ہوئی بے چینی میں سراپا ڈوبا ہوا تھا، اس لمحے کی ناخوشگواری کی وجہ سے جب پادری کی بیوی اپنے کمرے سے نکل کر اپنے پھوس دار بنگلے کے برآمدے میں آئی تھی، اور اس نے اپنے شوہر کو غصے سے دیکھا تھا۔ پھر اس کے دل میں صبح کی وہ یادیں پیدا ہوگئیں جنھوں نے اسے بری طرح ہلایا اور جھنجوڑا تھا۔

جو آدمی باکھا سے چھو گیا تھا اس کے پچکے ہوئے گالوں اور کرنل کی گول سفید چہرے کی بیوی کی نفرت کی نگاہ کی خاصیت ایک سی تھی۔ چھوئے ہوئے آدمی کا باہر نکلا ہوا نچلا جبڑا جس میں سے اندر کا گوشت تک نظر آرہا تھا اور جو اس کی زہر اگلتی ہوئی بولی سے ملتا تھا، باکھا کی نظروں کے سامنے آگیا۔ اور اس کی باہر نکلتی

ہوئی آنکھیں! کرنل کی بیوی نے بھی اپنی چھوٹی آنکھیں اپنی عینک کے پیچھے اسی طرح کھول رکھی تھیں۔ اُن سے باکھا زیادہ خوفزدہ ہوگیا تھا، اس آدمی کی باہر نکلتی ہوئی آنکھوں سے بھی زیادہ، کیونکہ وہ میم صاحب تھی اور کسی بھی میم کے غصے کے پیچھے اَن جانے، اَن دیکھے غیض و غضب کے طوفان کی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے باکھا کی نظر میں تو اس نے جو چند الفاظ بولے تھے ان میں، اس بہت دیر کی لگاتار گالی گلوچ کے مقابلے میں، جو چھوئے ہوئے آدمی نے کی تھی، سینکڑوں گنا زیادہ خوف تھا۔ دوسرے صبح کا واقعہ تو تاریخ کا معاملہ تھا اور آج کے منظر کے مقابلے میں، وقت اور جگہ کے لحاظ سے بڑے فاصلے کی بات تھی۔ لیکن ایک گورے کا قصہ تو کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی غلامانہ ذہنیت کے لیے میم صاحب زیادہ اہم تھی، اُس آدمی کے مقابلے میں جس کو اس نے چھو دیا تھا۔ وہ آدمی تو اس کے ملک کے بے شمار بھورے ہم وطنوں میں سے ایک تھا۔ میم صاحب کو ناراض کرنا تو اس کے لیے ایک جرم تھا جس کے لیے کسی بھی سزا کو برا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو مقابلتاً سستے میں ہی چھوٹ گیا تھا۔ اسے اس کے بارے میں خراب باتیں سوچنے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس نے غیر ارادی طور پر اس کے غصے کے خلاف اپنے احتجاج کو اُن لوگوں کے خلاف ردِ عمل میں سمو دیا جنھوں نے آج صبح اس کی بے عزتی کی تھی۔

اس کی توجہ ایک کالے کوڑھی کی طرف کھنچ گئی جو پھٹے ہوئے کپڑوں میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے کچّے زخموں پر دھوپ پڑ رہی تھی اور ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کا ٹُنڈا ٹُنڈا ہاتھ بھیک مانگنے کے لیے اٹھا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر یہ التجا تھی ــ ” بابا پیسہ دو۔“ باکھا کو اسے دیکھ کر گھن آنے لگی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ بُلا شاہ کے ریل کے سٹیشن کے پاس والی جی۔ ٹی۔ روڈ تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے راستے میں فقیروں کے گروہ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں بہت سے ڈھابے تھے اور ایک عورت ایک ڈھابے کے سامنے بیٹھی ہوئی رو رو کر روٹی مانگ رہی تھی۔ ایک چھوٹا بچہ اس کی باہوں میں تھا، ایک بچہ ایک تھیلے میں اس کی پیٹھ پر

لٹکا ہوا تھا اور ایک تیسرا اس کے لہنگے کو پکڑے کھڑا تھا۔ کچھ لڑکے لگاتار آنے والے تانگوں کے پیچھے پیچھے دوڑ کر پیسے مانگ رہے تھے۔ باکھا کو اس بات پر ایک شیطانی سی خوشی ہو رہی تھی کہ فقیر بھیک مانگ رہے تھے مگر ان کو کوئی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو اُسے قابلِ نفرت نظر آرہے تھے اور وہ جو رونے دھونے اور دعائیں دینے کا شور مچا رہے تھے، وہ اسے بڑا ناگوار لگ رہا تھا۔

اسے ایک ریل گاڑی کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی جو اس پُل کے نیچے سے گزر رہی تھی جس کے اوپر وہ اب چڑھ رہا تھا۔ اور عین اُسی وقت اسے گول باغ کی طرف سے ایک ایسا شور سنائی دیا جس نے خاموشی کے ماحول اور درختوں اور جھاڑیوں کے پتّوں تک کو جھنجوڑ سا دیا۔ دھوئیں کے بادل کے سایے ہیں، جسے انجن پُل کے اوپر پھینک رہا تھا اس کا گلا گھٹ سا گیا اور اس کی آنکھیں کچھ نہ دیکھ سکیں۔ پھر دھوئیں کے مرغولے، نہ نظر آنے والی غیر مرئی برف کے گالوں کی طرح پگھل گئے اور اپنے پیچھے کالک کی ایک سیاہ لکیر چھوڑ گئے۔ دھوپ میں وہ بھی غائب سی ہوگئی۔ ریل گاڑی بھاگ کر بلا شاہ سٹیشن کی ٹین کی چھت کے ٹھنڈے سایے میں پہنچ گئی تھی۔

اس وقت لوگوں کا شور ماحول کو چیرتا ہوا دو اطراف سے آرہا تھا۔ ایک، جو پلیٹ فارم سے آسمان تک اٹھ رہا تھا کیونکہ گاڑی آکر رکی تھی اور دوسرا گول باغ کے درختوں کی چوٹیوں پر سے جن کی ہریالی افق سے افق تک پھیل رہی تھی۔

باکھا ایک منٹ تک پیدل چلنے والوں کے لیے اِس پل کی چھت پر کھڑا رہا اور اس نے ٹین کی چھت کی طرف غور سے دیکھا۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے سینکڑوں لوگ گردنیں باہر نکالے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے گول باغ کی سمت دیکھا۔ میدان میں سفید کپڑوں میں ملبوس لوگوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ اس میدان میں عام طور پر شہر کے جیم خانہ کلب کے آدمی کرکٹ کھیلتے تھے۔ اب تو وہاں گہری خاموشی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا اور سنتا رہا۔ لوگ پھر یک زبان ہو کر شور کرنے لگے۔ جیسے کہ بجلی کی چمک اچانک آسمان کو منور کر دیتی ہے، باکھا کے

سامنے لاتعداد آوازوں کی لپک آسمان کے کناروں تک پہنچی اور ایک فلک شگاف نعرہ گونجا۔ "مہاتما گاندھی کی جے!" اور چند ہی لمحوں میں مشتاق لوگوں کی بھیڑ پُل پر چڑھنے لگی اور سب یہ چلّا رہے تھے۔ "مہاتما جی آ گئے ہیں"، "مہاتما جی آ گئے ہیں"۔

اِس سے پیشتر کہ باکھا انھیں مڑ کر دیکھتا، وہ پل کے جنوب کی طرف کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ایک گزرتا ہوا آدمی پیدل چلنے والوں کی سوالیہ نظروں کا یہ کہہ کر جواب دیتا جا رہا تھا کہ گول باغ میں جلسہ ہوگا جہاں مہاتما جی تقریر کریں گے۔

فوراً ساری بھیڑ، اور اِن میں باکھا بھی، گول باغ کی طرف دوڑی۔ باکھا نے اپنے آپ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے کے لیے بھی نہیں ٹھہرا۔ مہاتما کا لفظ ایک ایسا جادو کا مقناطیس تھا جس کی طرف وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی مانند، اندھادھند بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ملٹری بوٹ کی جوتوں اور پر اشتیاق تیز رفتار کے نیچے پُل کے نیچے کے لکڑی کے تختے کبھی چُرمُرا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک ہی سانس میں کئی کئی قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ وہ اس حقیقت کو بھی بھول گیا کہ وہ اچھوت تھا اور اس نے کچھ آدمیوں کو تو چھو بھی دیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے پاس نہ جھاڑو تھی، نہ ٹوکری اور لوگ اتنی جلدی میں تھے کہ کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ ایک بھنگی لڑکا انھیں چھوتا ہوا برابر سے نکل گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

پُل کے نیچے، تانگے اور موٹر لاری کے اڈّے کے ساتھ، جو سڑک گول باغ کے دروازے کے سامنے سے ہوتی ہوئی قلعے کو جاتی تھی، ایک گھڑ دوڑ کا میدان لگ رہی تھی۔ مختلف نسلوں، رنگوں، ذاتوں اور دھرموں کے لوگ میدان کی طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ بلا شادی کی کپڑوں کے ٹکڑوں کی مارکیٹ کے ہندو لالہ تھے جو ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھے، مقامی غالیچے کی مارکیٹوں سے کشمیری مسلمان تھے۔ سفید بے داغ سوتی ملبوسات میں، پاس کے دیہات سے مضبوط اور اکھڑ مزاج

سکھ تھے جو ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور ان کی پیٹھوں پر خریدی ہوئی اشیا کی گٹھڑیاں لدی ہوئی تھیں، سرخ گالوں والے تنومند اور تند شکل پٹھان تھے جنھوں نے لال قمیض پہنی ہوئی تھیں اور وہ خان عبدالغفار خاں کے پیروکار تھے جو صوبہ سرحد کے انقلابی تھے۔ پھر کالے چہروں والی، مکتی فوج کی بستی کی ہندوستانی عیسائی لڑکیاں تھیں جو چھوٹے رنگین سکرٹ، بلاؤز اور ایپرن پہنے ہوئے تھیں۔ اور نچلی ذات کی بستیوں کے لوگ تھے جنھیں باکھا نے دور سے پہچان لیا تھا مگر وہ اتنی جلدی میں تھا کہ کسی کو سلام بھی نہیں کر سکا۔ کہیں کہیں اِکّا دکّا یوروپین بھی تھے۔ ہر ایک آدمی موہن داس کرم چند گاندھی کو اپنی عقیدت پیش کرنے جا رہا تھا اور باکھا کی طرح انھوں نے بھی اپنے آپ سے سوال نہیں کیا کہ وہ کیوں جا رہے تھے۔ بس وہ جا رہے تھے، یہ ایک اجتماعی عمل تھا، چلنے، دوڑنے اور جلدی کرنے کا جس میں وہ سب مشغول تھے۔ اس وقت تو بس ان سب کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ کسی طریقے سے وہاں پہنچ جائیں، جتنی جلد ممکن ہو سکے۔ باکھا نے تیزی سے چلتے ہوئے سوچا کہ کاش کوئی نیچے جاتا ہوا پل ہوتا جس پر سے وہ لڑھک کر فوراً میدان میں پہنچ جاتا۔

اس نے دیکھا کہ فورٹ روڈ بڑی طویل اور بھیڑ بھڑکے والی تھی۔ اچانک ندی کے کنارے کھڑے ہوئے کسی ہرن کی طرح وہ ایک چھوٹی سی دلدل کے گرد گھوما جو گول باغ کے ایک کونے کے کمیٹی کے نل پھٹ جانے سے پیدا ہو گئی تھی اور دیوار کو پھاند کر اندر باغ میں آ گیا۔ کناروں پر اُگے ہوئے خوشبودار رنگ برنگے پھولوں کے پودوں کو تو تکلیف پہنچی مگر اس کے پیچھے والی بھیڑ کو فائدہ ہو گیا کیونکہ وہ بھی اس کے پیچھے بھیڑ بکریوں کی طرح اندر داخل ہو رہی تھی۔ اندر چھوٹی چھوٹی سایہ دار آرام گاہیں بھی تھیں جنھیں قدیم ہندو راجاؤں نے بنوایا تھا مگر اب کس مپرسی کی حالت میں تھیں۔ دراصل سب ہی خستہ حال تھیں۔ جب باکھا کے پیچھے پیچھے بھیڑ اندر داخل ہوئی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر چیز کو کچل دینے پر تلی ہوئی تھی چاہے وہ کتنی بھی پرانی اور خوبصورت کیوں نہ ہو، اگر وہ ان کے گاندھی کے مقاصد کی حصول یابی کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک عام آگاہی کے مقابلے میں کسی زیادہ یقینی جذبے سے جانتے تھے کہ پرانی تہذیب کی تمام چیزوں کا تباہ ہونا لازمی تھا تاکہ ان کی جگہ نئی چیزیں لے لیں۔ اِس لیے ہری گھاس کی ہر پتّی کو روند کر وہ دیدہ و دانستہ بے دردی سے اپنے ہی ایک حصّے کو قدموں سے کچل رہے تھے، جس سے اب انھیں نفرت تھی اور جس سے بچ کر وہ گاندھی کی شرن میں آنا چاہتے تھے۔

باغ کی چھوٹی چھوٹی سایہ دار آرام گاہوں کے پرے، میدان میں تو ایک جم غفیر بے قابو سا ہو رہا تھا اور ہزاروں لوگ ایسے اکٹھے ہو گئے تھے جیسے عبادت اور پوجا کے لیے آئے ہوں۔ بھیڑ کی جوشیلی بات چیت، نعرے بازی اور پرجوش اشارے امڈے ہوئے جذبات ایک خیال، صرف ایک خیال کی ترجمانی کر رہے تھے۔ گاندھی۔ ہانپتی ہوئی بھیڑوں کے جو آگے بڑھ رہی تھیں اس جذبۂ پرستاری میں جس کا آدھا اظہار ہو رہا تھا اور آدھا ہجوم نے دبایا ہوا تھا، ایک خوف اور ظلم کا عنصر بھی تھا۔ باکھا جب کرکٹ کے پویلین کے پرے پہنچ گیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک درخت سے لگ گیا۔ وہ الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ اپنے اندر کے اس جذبے پر اپنی گرفت ڈھیلی کر رہا تھا یا اس نے اسے گھما پھرا کر لوگوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہروں پر پھینک دیا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ وہ تو ایک بھنگی کا لڑکا تھا! اور یہ بات اس کی میلی کچیلی خاکی وردی سے ظاہر تھی کیونکہ باقی کے لوگ تو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے اور بھیڑ کے بیچ میں ایک ناقابلِ قبول دیوار تھی، ذات پات کی دیوار۔ وہ آگاہی کا وہ حصّہ تھا جسے وہ آسانی کے ساتھ دوسروں سے بانٹ سکتا تھا لیکن اسے سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اُسے تو کسی موری پر سے اٹھایا گیا تھا اور صدیوں کی پابندیاں اس کے راستے میں حائل تھیں اور اس کی اپنی زندگی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی انسانیت کے درمیان تھا جس نے اسے اپنی تہوں میں رکھ تو لیا تھا لیکن اسے اس بات سے روک بھی رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک احساس بھرا، جیتا جاگتا، جذبات سے پُر رابطہ قائم کر سکے۔ صرف گاندھی ہی اُسے ان سے ملاتا تھا، ذہنی طور پر، کیونکہ گاندھی ہر ایک کے ذہن

میں تھا، باکھا کے بھی۔ گاندھی انھیں شاید واقعی متحد کر دے گا۔ باکھا نے گاندھی کی انتظار کی۔

بڑے اشتیاق سے، غیر شعوری طور پر، اس نے ان سب باتوں کو یاد کیا جو اس نے اِس آدمی کے بارے میں سنی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک رشی تھا، کچھ اسے وِشنو اور کرشن کا اوتار مانتے تھے۔ ابھی حال ہی میں اس نے سنا تھا کہ دلی میں لاٹ صاحب کے گھر پر ایک مکڑی نے ایسا جالا بُنا تھا جس میں مہاتما گاندھی کی شکل صاف نظر آتی تھی اور اس کے نیچے انگریزی میں ان کا نام بھی مکڑی نے ہی بن دیا تھا۔ یہ ایک قسم کی تمام صاحب لوگوں ایک تنبیہ تھی کہ وہ ہندوستان سے چلے جائیں کیونکہ خود خدا نے یہ پیغام ایک چھوٹے سے کیڑے کے ذریعے سے بھیجا تھا کہ گاندھی سارے ہندوستان کا حکمران بنے گا۔ یہ بات کہ مکڑی کا جالا لاٹ صاحب کے گھر میں ظاہر ہوا تھا یقیناً بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ گاندھی کے بدن کو نہ تلوار کاٹ سکتی تھی، نہ کوئی گولی اس کے آر پار ہو سکتی تھی اور نہ کوئی آگ اسے جلا سکتی تھی!

"سرکار اس سے ڈرتی ہے۔" باکھا کے پاس کھڑے ہوئے ایک لالہ نے کہا "مجسٹریٹ نے بلاشاہ میں گاندھی کے آنے کے خلاف اپنا حکم واپس لے لیا ہے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اسے بغیر شرط کے جیل سے رہا کر دیا ہے۔" ایک بابو اخبار "ٹریبیون" کا محاورہ بڑی شان سے اپنی لیاقت ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"کیا وہ واقعی حکومت کا تختہ پلٹ دے گا؟" ایک دیہاتی نے پوچھا

"اس میں ایک شکتی ہے جو ساری دنیا کو بدل سکتی ہے۔" بابو نے جواب دیا اور گاندھی کے بارے میں اس نے وہ سارا مضمون اگلنا شروع کر دیا جو اس نے صبح "ٹریبیون" میں سے رٹ لیا تھا، "یہ انگریزی حکومت کچھ بھی نہیں ہے۔ اِس وقت یورپ اور امریکہ کا ہر ملک سیاسی، اقتصادی اور تجارتی طور پر اتھل پتھل ہو رہا ہے۔ ولایت کے باشندوں، انگریز لوگوں کی حالت کم خراب ہے کیونکہ ان لوگوں میں قدامت پسندی بھری ہوئی ہے، لیکن بہت جلد دنیا کے ہر ملک کو وہ مسئلے پیش آئیں گے جن کا حل مغرب کے ذہن اور اخلاقی نظریوں

میں بنیادی تبدیلی کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ نفس پرستی کی زندگی میں جو مغربی تہذیب کا نصب العین ہے ایک زبردست تبدیلی، نفس پر قابو پانے کے لیے، انفرادی اور اجتماعی سطح پر جدو جہد کرنے سے ہی لائی جا سکتی ہے۔ یہ باتیں ہندوستان کی دھارمک سبھیتا کا نچوڑ ہیں۔ ہندوستان دنیا کے لافانی مذہب کا پاک گھر رہا ہے۔ یہ مذہب ہر عورت اور مرد کو، اس کی پیدائش اور ماحول کے مطابق سکھاتا ہے، کہ کیسے اس کے لیے نفس کشی لازمی ہے اور یہ کہ نفس کشی کے ذریعے اسے ایک زیادہ ارفع تہذیب کی تخلیق کرنی ہے جس کی بنا پر وہ خالق سے ہمکنار ہو سکتا ہے جو تمام دلوں میں بستا ہے۔ خالق سے ہمکنار ہونے کی روحانی مسرت کے لیے تمام انسانیت اندھا دھند سرگرداں رہتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ نہ تمباکو نوشی، نہ سینما، نہ نفس پرستی اسے دھارمک ضبط کے راستے پر لے جا سکتی ہے۔ صرف نفس کشی ہی خالق سے ہمکنار ہونے کی روحانی مسرت حاصل کر سکتی ہے۔ جدید دنیا کو یہ راستہ صرف گاندھی ہی دکھا سکتا ہے۔ وہ ہی ہمیں ایشور پریم کا سچا راستہ دکھائے گا اور یہی بہتر بن سوراج ہے۔"

"بابو جی آپ تو بہت ہشیار ہو" دیہاتی تقریر کرنے والے کی طرف گھور کر دیکھتا ہوا بولا۔ وہ بابو کی تقریر سے بڑا متاثر ہوا، لیکن بالکل حیران تھا۔ اس کے لیے تو گاندھی ایک حکایت، ایک روایت، ایک پرماتما کی آواز تھا۔ اس نے پچھلے چودہ سالوں میں وقتاً فوقتاً یہ بھی سنا تھا کہ کس طرح ایک سنت اتنا بڑا بن گیا تھا جتنا گورو نانک، جو کرشن جی مہاراج کا اوتار تھا، جس سے فرنگی سرکار بہت ڈرتی تھی۔ اس کی بیوی نے اس سے اُن چمتکاروں کا ذکر کیا تھا جو اس سنت نے دکھائے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک رات وہ ایک مندر میں دیوتا کی طرف ٹانگیں کر کے سو گیا تھا۔ جب برہمنوں نے اسے جان بوجھ کر دیوتا کی طرف ٹانگیں کرنے کے لیے بُرا بھلا کہا تو وہ بولا کہ ایشور تو ہر جگہ ہے اور تم میری ٹانگیں اس طرف کر دو جدھر تم سمجھتے ہو کہ ایشور نہیں ہے۔ اس پر پنڈتوں نے اس کی ٹانگیں اٹھا کر دیوتا کی مورتی سے دور مخالف سمت میں کر دیں اور پھر ایک عجیب کرشمہ ہوا کہ دیوتا کی مورتی بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر اسی سمت آگئی جدھر اس کی ٹانگیں پنڈتوں

نے کردی تھیں۔ اس روز سے وہ اس سنت کے درشنوں کے لیے بے چین تھا۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ اس کی تسلی تو اسی وقت ہوگی جب وہ سنت جی کے پاؤں چھو سکے گی۔ خیر یہ ایک اچھی بات تھی کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ کسان نے سوچا کہ اگر اس کی بیوی آجاتی تو لڑکے بھی اس کے ساتھ آنا چاہتے اور وہ اس بے تحاشہ بھیڑ میں کچلے جاتے۔ اچھا ہوا انھیں پتہ نہیں تھا۔ "جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے خوشی ہے کہ میں اس کے درشن کر سکوں گا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ وہ اس روز آرہا ہے جس روز میں سامان خریدنے نکل آیا۔"

باکھا نے بڑی توجہ سے بابو کو سنا تھا اور اگرچہ وہ اس کی بلیغ تقریر کا ایک فقرہ بھی نہیں سمجھ سکا تھا، وہ اس کا مفہوم ضرور سمجھ گیا تھا۔

"بابو مجھے بتانا" باکھا نے اس دیہاتی کو گول چہرے والے، فیلٹ کیپ پہنے، عینک لگائے ہوئے آدمی سے کہتے سنا، جس نے تقریر کی تھی۔ "کیا وہ فرنگیوں کے جانے کے بعد ہماری نہروں کی دیکھ بھال کر سکے گا؟" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کسان کو بڑا مہمل خیال تھا کہ گاندھی کون تھا۔

"بھائی جی کیا تمہیں نہیں پتہ" بابو بولا "کہ مسٹر رادھا کمل مکرجی کے مطابق حضرت عیسیٰ کے چار ہزار سال پہلے ہمارے پاس قدیم ہندوستان میں نہریں تھیں؟ گرانڈ ٹرنک کی سڑک کس نے بنائی؟ انگریزوں نے نہیں!"

"لیکن مقدموں کا کیا ہوگا؟" جاٹ نے پھر پوچھا، "میرے گاؤں کے پانچ بڑے، پنچائت کو اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یا گاؤں کے کمینوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے اگر وہ کچھ زیادہ ہی آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور میں نے تو سنا ہے کہ گاندھی جی یہ کہتے ہیں کہ ہمیں سرکاری عدالتوں میں نہیں جانا چاہیئے اور اپنے معاملے پنچائت میں طے کرانے چاہئیں۔"

"ایک اچھی پنچائت" بابو زور دے کر بولا۔ "گاؤں والوں سے تھوڑا تھوڑا کام اس نقصان کو روکنے کے لیے لے سکتی ہے جو زمین کے کٹاؤ یا دوسرے اسباب سے ہوتا ہے۔ پنچائت آج ایک اچھی فیصلہ کرنے والی عدالت نہ ہو لیکن کبھی یہ

تھی اور ماضی میں ہمیشہ یہ رہی ہے۔ ہاں جہاں تک گاؤں کی بہتری کے لیے کچھ کام کرنے کا سوال ہے تم جانتے ہو کہ پنچایتوں نے دیش سیوا کے لیے کافی اچھا کام کیا ہے اور گاؤں کی حالت کو دیواریں اور سڑکیں وغیرہ بنوا کر کافی سدھارا ہے۔"

دہقان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ باکھا بھی کچھ نہیں سمجھا۔ لیکن جب کسان نے گاؤں کے کمینوں کا ذکر کیا تو باکھا کو یاد آیا کہ اس نے سنا تھا کہ گاندھی جی اچھوتوں کے ادھار کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ذات سے نکالے ہوئے لوگوں کی بستیوں میں تو حال ہی میں یہ افواہ چکر لگاتی رہی تھی کہ بھنگیوں اور چماروں کے لیے گاندھی جی نے برت رکھا ہوا تھا۔ باکھا کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نچلی ذاتوں کی مدد کرنے میں برت کا کیا تعلق تھا۔ "شاید وہ سوچتے ہیں کہ ہم غریب ہیں اور ہمیں کھانے کو نہیں ملتا۔" اس نے مہمل سے انداز میں نتیجہ نکالا۔ "اس لیے وہ بھی یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی کئی دن تک کھانا نہیں کھاتے۔"

"ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے، ہم کرنے کو تیار ہیں۔" لالہ نے بابو کی طرف ڈرامائی انداز سے ہاتھ کے اشارے سے باکھا کے خیالات میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہم مانچسٹر کے سوتی کپڑے اور بریڈ فورڈ کے ریشمی کپڑوں کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو سودیشی کپڑے کو تیار کرنے اور بیچنے کا واحد حق مل جائے گا۔ لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ گاندھی جی جاپان کے ساتھ کوئی معاہدہ کر رہے ہیں۔"

"یہ بات آپ مہاتما جی سے پوچھئے۔" بابو نے جلدی سے جواب دیا۔ کیونکہ اسے گیٹ کی طرف سے آتا ہوا شور سنائی دیا۔ اس نے سوچا کہ اس گیٹ میں سے گاندھی جی آ رہے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد پہنچ کر کسی ایسی جگہ پر کھڑا ہو جائے جہاں سے وہ اس عظیم آدمی کو اچھی طرح سے دیکھ سکے۔

"مہاتما جی سودیشی کے بارے میں نہیں بول رہے ہیں نہ بول نا فرمانی کے" ایک کانگرسی والنٹئر نے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "سرکار نے انھیں جیل سے اس لیے رہا کیا ہے کہ وہ سختی سے اپنے آپ کو ہریجنوں (گاندھی جی اچھوتوں کو ہریجن کہا کرتے تھے) کے کام تک یعنی چھوا چھوت کو ہٹانے تک محدود رکھیں گے۔" اور

اس تقریر کے بعد وہ آگے بڑھ گیا، وہ شان دکھاتے ہوئے جو اس نے خود اپنی طاقتور پوزیشن کی وجہ سے اپنا حق سمجھ لی تھی۔ وہ گاندھی جی کو دئے جانے والے استقبال کے دوران لوگوں کی سیوا کے لیے ایک کارکن مقرر ہوا تھا۔

"ہریجن" باکھا سوچنے لگا کہ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ لفظ پہلے کبھی گاندھی جی کے تعلق سے سن رکھا تھا؛ لیکن اس کا ضرور ہم سے کچھ تعلق ہے، بھنگیوں اور چماروں سے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا "ہم ہریجن ہیں۔" اسے یاد آیا کہ ایک مہینہ ہوا کیسے کچھ کانگرسی ذات سے خارج ہوئے لوگوں کی گلی میں آئے تھے اور انھوں نے ہریجنوں کے بارے میں تقریر کی تھی۔ اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ وہ ہندوؤں سے الگ نہیں تھے اور ان کے کسی کو چھو لینے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ آدمی بھرشٹ ہو گیا۔ یہ لفظ جو اس والینٹر نے بولا تھا سیدھا باکھا کے دل میں اتر گیا۔ اسے پتہ تھا کہ یہ لفظ اس کے لیے بھی ہے۔ "اچھا ہوا میں یہاں آگیا۔" اس نے سوچا "کیا وہ واقعی ذات سے نکالے گئے لوگوں کے بارے میں بولیں گے؟ ہمارے بارے میں چھوٹا، رام چرن، میرے باپ اور میرے بارے میں؟ میں حیران ہوں کہ وہ کیا بولیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مکتی فوج کے صاحب نے کہا تھا کہ امیر اور غریب، برہمن اور بھنگی ایک ہی ہیں۔ اب گاندھی مہاتما ہمارے بارے میں بولیں گے۔ اچھا ہوا میں آگیا اگر انھیں پتہ ہوتا کہ آج صبح میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں تو چاہوں گا کہ انھیں اٹھ کر سب کچھ بتا دوں۔" اور اس نے تصور کیا کہ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہو رہا تھا۔

جب چاروں طرف خاموشی تھی اور جلسہ شروع ہو چکا تھا تو وہ مہاتما کو بتا رہا تھا کہ جس شہر میں آپ چھوا چھوت دور کرنے کے لیے آئے تھے، اس شہر کا ایک آدمی آج صبح اس سے چھو گیا تھا اور اس نے اسے گالیاں دیں اور مارا تھا۔" پھر مہاتما شاید اس آدمی کی خبر لے گا یا کم سے کم وہ جلسے میں بیٹھے ہوئے شہریوں کو ہی برا بھلا کہے گا۔ پھر وہ لوگ میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو آج صبح انھوں نے کیا تھا۔" اس نے اپنے اندر، اس منظر میں موجودگی پر بڑا جوش و خروش محسوس کیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک اداکار محسوس کیا۔ پھر اس

کے پیٹ میں کوئی عجیب سی چیز ہلنے لگی۔ وہ تذبذب میں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک چمک دوڑ گئی اور اس کے گال سرخ ہو گئے۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ "مہاتما گاندھی کی جے!" ایک زور کا نعرہ پڑا اور اس کا تناؤ کم ہو گیا۔ یہ نعرہ کافی فاصلے سے آ رہا تھا اور اس کی تازگی نے اس کے بدن کی گرمی کو بھی دور کر دیا۔ ایک اچانک خوف سے جو اس کی روح میں گھس رہا تھا اس نے آرام سا محسوس کیا۔

اس نے سامنے دیکھا، ایک بہت بڑی بھیڑ گول باغ کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انھوں نے ایک موٹر کار کو گھیر لیا جس میں شاید مہاتما گاندھی سفر کر رہے تھے۔ باکھا نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہاں ساکت کھڑا رہے یا آگے کی طرف بھاگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ تو مہاتما کی طرف دوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا اگرچہ مہاتما نے آج کے دن کے لیے ذات پات کی تفریق کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن اس نے اگر کسی کو چھو دیا تو جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ "مہاتما تو اتنی دور ہوں گے کہ وہ آ کر میری مدد بھی نہیں کر سکیں گے۔" وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ پھر اس نے اپنے اوپر درخت کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ درخت کی شاخوں پر ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے عقاب اپنے شکار کی تاک میں بیٹھے ہوں۔ وہ اس کے تنے کی طرف بڑھا۔ اس کے فوجی بوٹ ایک رکاوٹ تھے مگر وہ گھٹنوں کو درخت کے تنے سے لگا کر اوپر چڑھ ہی گیا۔ وہ ایک شاخ پر بیٹھا ہوا بندر لگ رہا تھا مگر یہاں سے وہ سڑک پر بڑھتے ہوئے جلوس کو پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔

پھولوں کی پتیوں کی بوچھاڑ کے پیچھے جو مہاتما گاندھی کے بھگت اس پر برسا رہے تھے، لوگ طرح طرح کے رنگین جھنڈے لیے ہوئے تھے۔ گیندے، چمیلی اور مولسری کے ہار اس کی گردن میں پڑے ہوئے تھے۔ "مہاتما گاندھی کی جے!" "ہندو، مسلمان، سکھ کی جے!" "ہریجن کی جے!" کے نعروں کے درمیان یہ چھوٹا سا عظیم آدمی اب سامنے سے آتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا جسم ایک سفید دودھیا کمبل میں لپٹا ہوا تھا اور صرف اس کا کالا پورے طور پر منڈا ہوا سر ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے کان باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ پیشانی چوڑی

تھی اور اس کی لمبی ناک پر عینک ٹکی ہوئی تھی اور عینک کے شیشے بیچ میں سے دو حصوں میں بنٹے ہوئے تھے۔ اوپر والے دور دیکھنے کے لیے اور نیچے والے پڑھنے کے لیے۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس کے منہ کے نیچے اُس کی واضح اور سخت ٹھوڑی میں ایک مخصوص شرارت تھی اور اس کی چھوٹی سی گردن پر اس کے لمبوترے بے دانتوں کے جبڑے آرام سے جھکے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے چہرے میں ایک خاص خوبصورتی اور فرشتہ پن تھا، چاہے وہ خوب تیل ملی ہوئی کھوپڑی ہو جو عین وسط میں ایک چوٹی کے چاروں طرف چمک رہی تھی یا اس کی آسمانی شخصیت کے گرد وہ ہالہ جو کسی سنہری رنگ کے چکر کی مانند چمک رہا تھا۔

باکھا نے مہاتما کی طرف خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے دیکھا۔ اسے یہ رشی کسی بچے کی طرح نظر آیا جو سمٹا ہوا دو عورتوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا، ایک ہندوستانی اور ایک انگریز۔

" وہ کستوربا گاندھی ہے " باکھا نے ایک اسکول کے بچے کو اپنے دوست سے آہستہ سے کہتے ہوئے سنا جو درخت پر اس کے برابر والی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔

" اور وہ دوسری عورت کون ہے ؟ " لڑکے کے دوست نے پوچھا

" مہاتما جی کی دوسری چیلی، مس سلیڈ، یعنی میرا بہن۔ وہ ایک انگریز ایڈمیرل کی لڑکی ہے "

" وہ تو میری طرح کالا ہے " باکھا نے اپنے آپ سے کہا " لیکن بلاشبہ وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہوگا " اور اس نے بڑے تناؤ سے کار کی انتظار کی جو عین اس کی آنکھوں کی زد میں بے شمار مردوں اور عورتوں کی بھیڑ سے گھری ہوئی تھی۔ وہ سب مہاتما کے پاؤں چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ کانگرس کے والینٹر، پگڑیوں، فلفی ٹوپیوں اور گاندھی کی کشتی نما ٹوپیوں میں سے ایک راستہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور آخر کار وہ کار کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ کار کا انجن بند کیا ہوا تھا اور کچھ لوگ دروازے سے کھینچ رہے تھے اور کچھ پیچھے

سے دھکا لگا رہے تھے۔ استقبالیہ دروازہ عارضی طور پر میدان کے ایک کونے میں کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں والے درختوں کو کھڑا کر کے بنایا گیا تھا اور اسے پھولوں اور رنگین کاغذ کی بیلوں سے سجایا گیا تھا۔

باکھا نے ایک زرد رنگ کے انگریز کو دیکھا جو، باکھا جانتا تھا، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ وہ سڑک کے کنارے پر اپنی خاکی وردی پہنے کھڑا تھا جو برجیس، گھٹنوں تک کے لمبے پالش کیے ہوئے چمکدار چمڑے کے بوٹ اور نیلی جھالر والے سولہ ہیٹ پر مشتمل تھی۔ اتنا چست تو نہیں جتنے فوجی افسر ہوتے ہیں لیکن پھر بھی باکھا کی نظروں میں اس کی وردی میں صاحب لوگوں کے کپڑوں کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ لیکن اس وقت باکھا کو صاحب لوگوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، غالباً اس لیے کیونکہ ہندوستانیوں کی اس زبردست بھیڑ کے بیچ میں، جو اپنے رہنما کے لیے جوش و خروش سے بھری ہوئی تھی، غیر ملکی آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ نا اہم تھا اور اس نظام کا نمائندہ تھا جس کا دیسی آدمیوں سے بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا۔

"مہاتما گاندھی کی جے، مہاتما گاندھی کی جے!" یہ نعرے دھوپ میں رچی شام کو چیرتے ہوئے اوپر گونج اٹھے۔ باکھا کی توجہ بھی اس آدمی سے جو برٹش راج کی طاقت کا نمائندہ بنا کھڑا تھا ہٹ کر مہاتما کی چھوٹی سی شخصیت کی طرف اٹھ گئی جو کانگرس کے پنڈال میں چبوترے پر وسط میں بیٹھے تھے۔ اُن کے اردگرد اُن کے بھگت بیٹھے ہوئے تھے جو ننگے پاؤں اوپر آئے تھے، ہاتھ جوڑ کر انھیں پرنام کیا تھا اور پھر بکھر کر ان کے آس پاس بیٹھ گئے تھے۔

مہاتما گاندھی نے اپنی شال کے تہوں میں سے اپنا دایاں بازو نکالا اور اسے اٹھا کر بڑی نرمی سے بھیڑ کو آشیرواد دی۔ آوازوں کا شور و غل ایک دم بند ہو گیا جیسے اس کے قدموں میں پڑی ہوئی اتنی بڑی مخلوق کو بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس عجیب و غریب آدمی کے پاس وہ قوت اور قابلیت معلوم ہوتی تھی کہ وہ ایک ڈرامائی عمل سے مختلف رنگوں کے اور مختلف زبانیں بولنے والے ملک کو اپنے گرد سمیٹ سکتا تھا۔ کوئی آدمی بھجن گانے کے لیے کھڑا ہو گیا

مہاتما جی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پوجا کرنے لگے۔ اس لمحے کے سکوت میں باکھا اپنے دن بھر کے تجربات کو بھول گیا، اس آدمی کو جس کو اس نے چھو دیا تھا، پنڈت کو، گلی کی عورت کو، اپنے باپ، رام چرن اور چھوٹا کو، کھیتوں اور پہاڑیوں کی طرف اپنی سیر کو، پادری اور اس کی بیوی کو۔ اس کے سامنے اِس وقت صرف وہ مرد اور عورتیں تھیں، جو پگڑی پہنے ہوئے، ٹوپیاں ٹکائے اور سروں پر پلّو ڈالے، اس کے سامنے، عورتیں اور مرد، گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی تمام تر توجہ اس وقت ایک ہی چیز، صرف ایک ہی ہستی پر مرکوز تھی اور وہ تھی۔ گاندھی۔ اس نے اِس ہندو بھجن کی ہر لائن کو سنا۔

اٹھ جاگ مسافر بھور بھئی
اب رَین کہاں جو سووت ہے
جو سووت ہے وہ کھووت ہے
جو جاگت ہے وہ پاوت ہے
جاگو جاگو، نیند سے اپنی انکھیاں کھولو
جس ایشور نے تمہیں بنایا، اس کو یاد کرو
پریم کا مطلب نہیں ہے نیند، شرم سے آنسو بہاؤ
رکھوالی وہ کرتا ہے سدا، نہ تم یہ بھولو
آتما کو پاپ سے بچاؤ، اور مکتی پالو
پاپیوں کے لیے آرام اور چین کہاں
گھٹنے ٹیک کر رونے سے اب کیا ہوتا ہے
جب تو نے اپنا بوجھ خود ہی بڑھایا ہے
جو کل کرنا ہے وہ آج کر لے
جو آج کرنا ہے وہ اب کر لے
اب کا ہیکو پچھتاوت ہے
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

پھر اس کی توجہ بکھرنے لگی۔ اس کا ذہن اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اس نے اُس دوڑ

کے بارے میں سوچا جو اسے وہاں پہنچنے کے لیے لگانی ضروری تھی۔ اس نے دیکھا کہ ہر آدمی بہت ساکت تھا۔ اسے ہر ایک آدمی کو بہت سنجیدہ دیکھ کر بڑی جھنجلاہٹ ہوئی۔ یہ سکوت تو اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا کوئی حصہ اڑ کر یا بخارات بن کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے لگا کہ اسے مہاتما کے سامنے بیٹھی ہوئی بھیڑ کا جزو ہونے کا فخر حاصل تھا۔ بھجن بڑا بوجھل معلوم دیا لیکن دوسرا احساس کافی ہلکا تھا۔ سنت کتنا پاکیزہ نظر آ رہا تھا لیکن پھر بھی اس میں ایک خاص حلاوت اور گرمی گھلی ملی تھی۔ وہ بچے کی طرح مسکراتا تھا۔ باکھا نے اس کی طرف دیکھا۔ صرف اسی طریقے سے وہ خود آگاہی کے اپنے احساس سے فرار پا سکتا تھا۔ ایسا کر کے وہ خود کو فراموش کر گیا اور اپنے اردگرد ایک شئے کو بھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے یہی کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے سامنے بھورے اور کالے چہرے ایک پر سکوت سرور میں لپٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی ان ہی کی طرح محسوس کرے اور پوری طرح کھو جائے۔ باکھا کی خوش قسمتی سے عین اس وقت مہاتما جی نے اپنی تقریر کر دی۔ پہلے پہل تو ان کی آواز بہت ہی ہلکی تھی اگرچہ وہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعے سے بول رہے تھے۔

"میں باہر آگیا ہوں" انھوں نے آہستہ سے کہا جیسے وہ ہر لفظ کو ناپ رہے ہوں اور کسی دوسرے سے بولنے کی بجائے اپنے سے بول رہے ہوں۔ "پرا تشچت کی اس کڑی آزمائش سے جو میں نے اس مقصد کے لیے کیا تھا جو مجھے اتنا پیارا ہے جیسے میری زندگی۔ نئے آئین میں جو کونسلیں بنیں گی اس میں کمزور اور پچھڑی ذاتوں کے ہمارے بھائیوں کے لیے الگ سیٹیں رکھ کر انھوں نے "تقسیم کرو اور راج کرو" کی نیتی پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں وشواس نہیں کرتا کہ نئے آئین کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنے میں انگریزی نوکر شاہی سچائی سے کام لے رہی ہے۔ لیکن یہ ان شرطوں میں سے ایک ہے جن پر مجھے جیل سے رہا کیا گیا ہے کہ میں سرکار کے خلاف کوئی پراپیگنڈہ نہیں کروں گا۔ اس لیے میں اس کا ذکر اور نہیں کروں گا۔ میں صرف اچھوتوں کے بارے میں بولوں گا جنھیں حکومت نے ایک نیا قانون اور سیاسی حیثیت دے کر ہندو دھرم سے علیحدہ کرنے کی

کوشش کی ہے۔"

"جیسا کہ آپ سب کو پتہ ہے کہ ہم تو ایک باہر کے ملک کی قوم کے شکنجے سے آزادی مانگ رہے ہیں۔ ہم خود اپنے پاؤں تلے صدیوں سے لاکھوں انسانوں کو روند رہے ہیں اور اس کا ہمیں ذرا سا بھی پچھتاوا اور دکھ نہیں ہے۔ میرے لیے تو ان آدمیوں کا سوال اخلاق اور دھرم کا ہے۔ جب میں نے ان کے لیے مرن برت رکھا تو ایسا میں نے اپنے ضمیر کی پکار پر کیا۔"

باکھا ان الفاظ کو نہیں سمجھا۔ وہ بے چین تھا۔ اس نے امید کی کہ مہاتما ان باتوں کے بارے میں بولتا نہیں جائے گا جو اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس کی خواہش جلد ہی پوری ہو گئی کیونکہ ایک اہم لفظ اس کے جذبات کی نمائندگی کر رہا تھا۔

"لیکن اچھوت کو" مہاتما کہہ رہے تھے، "میں ہندو دھرم پر سب سے بڑا کلنک، کا داغ سمجھتا ہوں۔ میرا یہ وچار اس وقت سے ہے جب میں بچہ تھا۔"

اب اُن کی تقریر دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ باکھا نے اپنے کان کھڑے کر لیے۔

"میں مشکل سے بارہ سال کا تھا جب یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا ہمارے گھر میں ایک بھنگی جس کا نام اُکا تھا ٹٹیاں صاف کرنے آیا کرتا تھا۔ میں اکثر اپنی ماں سے پوچھتا تھا کہ اس کو چھونا کیوں برا تھا اور مجھے اسے چھونے سے کیوں منع کیا جاتا تھا۔ اگر غلطی سے میں اُکا کو چھو لیتا تھا تو مجھے اشنان کرنے کو کہا جاتا تھا۔ اگرچہ قدرتی طور پر میں کہا مان لیتا تھا لیکن میں اس کے خلاف مسکرا کر احتجاج ضرور کرتا تھا کہ دھرم چھوا چھوت کی اجازت نہیں دیتا اور یہ ناممکن تھا کہ ایسا کبھی ہو سکتا ہو۔ میں بہت کہنا ماننے والا اور فرمانبردار بچہ تھا لیکن اپنے والدین کی عزت کا دھیان رکھتے ہوئے میرا اکثر ان معاملوں میں ان سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنی ماں کو بتا دیا کہ وہ اُکا کے ساتھ کسی کے چھو جانے کو پاپ سمجھ کر سراسر غلطی کر رہی تھی۔ یہ پاپ نہیں ہو سکتا تھا۔"

میں اسکول جاتا ہوا راستے میں 'اچھوتوں' کو چھو لیتا تھا اور کیونکہ میں اپنے ماں باپ سے اس بات کو چھپاتا نہیں تھا، میری ماں مجھے بتاتی تھی کہ اس ناپاک عمل کے بعد پاک صاف ہونے کا سب سے چھوٹا اور آسان طریقہ یہ تھا کہ کسی گزرتے ہوئے مسلمان کو چھو لیا جائے۔ اس لیے اپنی ماں کی عزت اور اس کی خوشی کی خاطر میں اکثر ایسا کر لیتا تھا مگر میں نے کبھی وشواس نہیں کیا کہ ایسا کرنا کوئی مذہبی ضرورت تھی۔"

جیسے جیسے مہاتما کی بتائی ہوئی ان کی چھوا چھوت میں دلچسپی کی کہانی کا ایک ایک حصّہ باکھا کے کانوں میں پڑا، اسے محسوس ہوا کہ وہ اُکا بھنگی تھا۔ اس طرح کا احساس کرکے اس نے سوچا کہ وہ مہاتما کے زیادہ قریب ہو جائے گا جو ایک حقیقی ہمدرد تھا۔ "لیکن تقریر، تقریر۔۔۔" اسے اچانک پتہ لگا کہ وہ تو مہاتما کی تقریر کے الفاظ کو نہیں سن رہا تھا۔ وہ ایک دم متوجہ ہو گیا اور تقریر کو اس جگہ سے سننے لگا۔

"یہ حقیقت کہ ہم پرماتما کو "بھرشٹ" آتماؤں کا پاک کرنے والا مانتے ہیں، اس بات کو پاپ بنا دیتی ہے کہ ہم ہندو دھرم میں پیدا ہوتے کسی آدمی کو بھرشٹ سمجھیں۔ ایسا کرنا ایک شیطانی حرکت ہے۔ میں تو یہ دہرا دہرا کر کبھی نہیں تھکتا کہ یہ ایک بڑا پاپ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا یہ خیال بارہ سال کی عمر سے پختہ ہو گیا تھا مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس وقت بھی چھوا چھوت کو گناہ سمجھا تھا۔

"میں قومی دن کے موقعے پر نیلور میں تھا۔ میں وہاں اچھوتوں سے ملا اور میں نے پرارتھنا کی جیسی میں نے آج کی ہے۔ میں خود مکتی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں دوبارہ پیدا ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر مجھے دوبارہ جنم لینا پڑا تو میں ایک اچھوت پیدا ہونا چاہوں گا تاکہ میں بھی ان کے دکھ تکلیفوں اور ان پر لگائے ہوئے الزامات کو سہہ سکوں اور اُن کو ان کی قابلِ رحم حالت سے نجات دلا سکوں۔ اس لیے میں نے یہ پرارتھنا کی کہ اگر میں دوبارہ جنم لوں تو برہمن، کشتری، ویش اور شودر کے طور پر نہیں بلکہ ایک اچھوت کے طور پر۔"

"مجھے بھنگی کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ میرے ساتھ آشرم میں ایک اٹھارہ سال کا برہمن لڑکا بھنگی کا کام کر رہا ہے تاکہ وہ آشرم میں بھنگی کے کام سے جو صفائی ہوتی ہے اسے سیکھ سکے۔ وہ لڑکا کوئی سماج سدھارک نہیں ہے۔ وہ قدامت پسندی میں پیدا ہوا اور پلا تھا۔ وہ باقاعدہ گیتا پڑھتا ہے اور بڑی لگن سے پوجا پاٹھ کرتا ہے۔ جب وہ پرارتھنا سبھا میں پرارتھنا کرتا ہے تو اس کے مدھر گیت ہر ایک کے دل کو موم کرکے اس میں پریم بھر دیتے ہیں۔ لیکن اس نے سوچا کہ اس کی کامیابیاں نامکمل ہیں جب تک کہ وہ ایک مکمل بھنگی نہیں ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ آشرم کا بھنگی اپنا کام ٹھیک ٹھاک کرے تو اسے یہ کام خود کرنا ہوگا اور اس طرح مثال قائم کرنی ہوگی۔"

باکھا کی نس نس میں مسرت اور جوش بھر گیا۔ یہ کہ مہاتما خود بھنگی کے گھر میں جنم لینا چاہتے ہیں! یہ کہ انھیں بھنگی کا کام پسند تھا! وہ انسان سے پریم کرتے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنا سارا جیون ان کے ہاتھوں میں سونپ سکتا تھا۔ پھر میں ان سے بات بھی کر سکتا تھا اور انھیں کہہ سکتا تھا کہ اسے جیسے چاہیں استعمال کریں۔ ان کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ جاکر ان کے آشرم میں بھنگی کا کام کر سکتا تھا۔ "پھر میں ان سے بات بھی کر سکتا تھا" اس نے اپنے آپ سے کہا "لیکن میں تقریر نہیں سن رہا ہوں، نہیں سن رہا ہوں، مجھے ضرور سننی چاہیے۔"

"اگر یہاں کوئی اچھوت ہیں" اس نے مہاتما کو کہتے ہوئے سنا "تو انھیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ ہندو سماج کو صاف کر رہے ہیں۔" (اسے محسوس ہوا کہ وہ چلّا کر کہے کہ وہ ایک اچھوت وہاں تھا مگر وہ نہیں جانتا کہ مہاتما کا "ہندو سماج کو صاف کرنے سے کیا مطلب تھا۔) اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے مہاتما جی کے الفاظ کی طرف کان لگایا اور سنا "اس لیے انھیں اپنی زندگیوں کو صاف ستھرا بنانا ہے۔ انھیں صفائی کی عادتیں ڈالنی ہوں گی تاکہ کوئی بھی ان کی طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ ان میں کچھ شراب پینے اور جوا کھیلنے کے عادی ہیں۔ ان کو یہ عادتیں چھوڑنی ہوں گی۔"

" وہ ہندو ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ وہ دھارمک کتابیں پڑھتے ہیں۔

اس لیے اگر ہندو انھیں ستاتے ہیں تو انھیں سمجھنا چاہیئے کہ قصور ہندوؤں کا نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو اس دھرم کے ہیں۔ اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے انھیں خود کو صاف ستھرا رکھنا ہوگا۔ انھیں بری عادتوں سے چھٹکارا پانا پڑے گا، جیسے دارو پینا اور مردار جانوروں کا گوشت کھانا۔"

"لیکن اب، اب تو مہاتما جی ہم پر الزام لگا رہے ہیں!" باکھا سوچنے لگا۔ "یہ انصاف نہیں ہے۔" وہ تقریر کے آخری حصّوں کو جو اس نے سنے تھے، بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ پھر مہاتما کی طرف متوجہ ہوا۔ "انھیں چاہیئے کہ وہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا بچا کھچا کھانا لینے سے انکار کر دیں، چاہے وہ کتنے بھی صاف ستھرے سمجھے جاتے ہوں۔ وہ صرف! ناج لیں، اچھا بڑھیا اناج، خراب اور گندا نہیں اور وہ بھی اسی وقت جب وہ شائستگی سے اسے پیش کریں۔ اگر وہ ان سب باتوں پر عمل کریں گے جو میں نے بتائی ہیں تو انھیں نجات حاصل ہو جائے گی۔"

یہ بات باکھا کی پسند کی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ مہاتما کی طرف مڑ کر ان سے کہے، "مہاتما جی اب آپ ٹھیک بول رہے ہیں۔" اس نے یہ بھی احساس کیا کہ اب وہ مہاتما جی کو بتانا چاہتا تھا کہ آج کے ہی دن اور اسی شہر میں جس میں وہ بول رہے تھے اسے نالی کے پاس سے اوپر سے پھینکی ہوئی روٹی اٹھانی پڑی اور آج ہی، اسی شہر میں اس کے بھائی کو سپاہیوں کی پلیٹوں کا بچا کھچا کھانا منظور کرنا پڑا اور وہی کھانا ان سب کو کھانا پڑا۔ باکھا نے اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھا کہ مہاتما جی کو اس پر رحم آرہا تھا اور وہ اسے تسلّی دے رہے تھے۔ اس عظیم آدمی کی ہمدردی ایک مرہم تھی جو کتنا آرام پہنچا رہی تھی۔ "کاش مہاتما جی جا کر میرے باپ سے کہہ دیں کہ میرے ساتھ سختی نہ کیا کرے۔ اگر وہ جا کر باپ کو بتا دیں کہ کیسے مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگر وہ جا کر میرے باپ کو صرف اتنا کہہ دیں کہ میری مصیبتوں میں میری ہمدردی ان کے ساتھ ہے تو وہ فوراً مجھے واپس لے لیگا اور اس کے بعد مجھے کبھی نہیں ستائے گا۔"

"میں ایک قدامت پسند ہندو ہوں اور میں جانتا ہوں کہ فطرتاً ہندو گناہ

پسند نہیں ہیں " باکھا نے مہاتما کو کہتے سنا " وہ جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے تمام کوئیں، مندر، سڑکیں، اسکول اور ہسپتال اچھوتوں کے لیے کھول دئے جائیں۔ اور اگر تم لوگوں کو مجھ سے پیار ہے تو مجھے اس پیار کا جبوا چھوت ماننے کے خلاف پرچار کرکے سیدھا ثبوت دو۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنے میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہونی چاہیئے۔ پرامن ترغیب ہی اس کا واحد ذریعہ ہونا چاہیئے۔ میری جو دو زبردست خواہشیں مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں وہ اچھوتوں کا اُدّھار اور گئو رکشا ہیں۔ جب میری یہ دونوں باتیں پوری ہو جائیں گی تو وہی سوراج ہے اور اسی میں میری آتما کی مکتی ہے۔ پرماتما آپ کو شکتی دے کہ آپ بھی ان باتوں کی تکمیل سے اپنی آتما کی مکتی حاصل کریں۔"

جب مہاتما کی تقریر کے بعد بھیڑ تتر بتر ہوگئی تو باکھا درخت کی شاخ پر ٹھہرا رہا جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ تقریر کے آخری حصے کا ایک ایک لفظ اسی خوف اور غصے کے شدید، گہرے جذبے کی گونج تھی جو اس کا اپنا تھا، اس امتیاز پر جو اونچی ذات کے ہندو اپنے اور اچھوتوں کے بیچ کرتے تھے۔ مہاتما نے تو اپنی تقریر سے اس کی روح کی گہرائیوں کو چھو لیا تھا۔ " وہ یقیناً ایک نیک آدمی ہے!" باکھا بولا۔

بھیڑ کے بیچ میں سے " مہاتما جی کی جے!" ، " ہندو مسلمان کی جے!" اور " ہریجن کی جے!" کے گھٹے گھٹے نعرے پھر بلند ہوئے اور باکھا کو پتہ لگ گیا کہ مہاتما پنڈال سے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ درخت پر اپنی جگہ پر جما رہا اور اسے اپنے صبر کا انعام مل گیا جب اس نے اپنے نیچے سے گزرتے ہوئے مہاتما کو دیکھ لیا!

ایک آدمی اونچے لکڑی کے تختے پر بیٹھا ہوا اپنے پاس رکھی ہوئی بالٹی میں سے چاندی کے برتن میں ترکی ٹوپی پہنے ہوئے مسلمانوں اور سفید گاندھی ٹوپی والے ہندوؤں کو پانی پلا رہا تھا۔

" انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کر دیا ہے " ایک شہری اس بھائی چارے اور انسانیت کی چمک سے متاثر ہو کر بولا جو مہاتما نے اپنے پیچھے چھوڑ دی

تھی۔" ولایتی کپڑا پہننا چھوڑ دو۔ اسے آگ لگا دو" کانگرس کے والینٹیر چلا رہے تھے اور باکھا نے دیکھا کہ واقعی لوگ اپنی فیلٹ ٹوپیاں، اپنی ریشمی قمیض اور دوسرے کپڑے ایک ڈھیر میں پھینک رہے تھے اور اس ڈھیر کو جلد ہی آگ لگا دی گئی اور اس میں سے شعلے لپکنے لگے!

"بہن" ایک دوسرے شہری نے ایک گھسیارے کی بیوی سے کہا جو اپنے بھاری لہنگے میں اپنے دو بچوں کو گھرے جا رہی تھی "آؤ میں تمہیں بھیڑ میں سے نکال دوں۔ بڑے لڑکے کا ہاتھ مجھے پکڑا دو۔"

صرف ایک عجیب آواز ایسی تھی جو دوسری آوازوں سے مختلف تھی۔

"گاندھی بکواس ہے" کوئی کہہ رہا تھا "وہ بے وقوف ہے، وہ دیوانہ ہے۔ ایک ہی سانس میں وہ کہتا ہے کہ وہ چھوا چھوت کو ختم کرنا چاہتا ہے اور دوسرے میں وہ اپنے آپ کو قدامت پسند ہندو کہتا ہے۔ وہ ہمارے زمانے کی رفتار اور امنگوں کے خلاف ہے جن کا نام جمہوریت ہے۔ وہ تو عیسیٰ کی پیدائش سے بھی چار سو سال پہلے کی دنیا میں رہ رہا ہے جو سودیشی اور چرخے کی بات کرتا ہے۔ ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں نے رُوسو، ہالبس، بینتھم اور جان سٹوآرٹ مل کا مطالعہ کیا ہے اور ہیں ....."

باکھا درخت پر سے ایک کالے ریچھ کی مانند کود پڑا اور جمہوریت پسند آدمی کی توجہ باکھا کی مضحکہ خیز شکل وصورت کی طرف کھنچ گئی۔ باکھا شرما کر ایک طرف کو کھسکنے والا تھا مگر وہ آدمی جو ایک گورے رنگ کا مسلمان تھا اور جس نے بہت عمدہ انگریزی وضع کا سوٹ پہنا ہوا تھا جو باکھا نے آج تک نہیں دیکھا تھا، اسے ٹوک کر بولا۔

"آؤ تم کالا آدمی، اِدھر آؤ۔ جاؤ اور صاحب کے لیے ایک سوڈا واٹر کی بوتل لے کر آؤ۔"

باکھا چونک کر لوٹ آیا اور کھڑا ہو کر اس "بڑے" آدمی کی طرف دیکھنے لگا جس نے اسے بلایا تھا۔ اس آدمی نے اپنی بائیں آنکھ پر ایک شیشہ لگا رکھا تھا اور باکھا نے ایسی کوئی چیز آج تک نہیں دیکھی تھی اور وہ حیران تھا کہ بغیر فریم

کے ایک شیشہ آنکھ پر کیسے ٹک سکتا تھا۔

"ہماری طرف گھور کر مت دیکھو۔" جنٹلمین نے زور سے کہا اور باکھا سوچتا رہا کہ یہ آدمی کون ہو سکتا تھا۔ اس کا رنگ اتنا زرد تھا کہ وہ انگریز تو ہو نہیں سکتا تھا اور اتنا گورا تھا کہ ہندوستانی بھی نہیں ہو سکتا تھا اور اتنے عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھوں میں پیلے رنگ کے دستانے تھے اور اس کے سفید رنگ کے عمدہ ربڑ کے جوتے تھے۔

"ہم دیسی صاحب، ہم کو گھور کر دیکھنا نہیں مانگتا" اس آدمی نے جان بوجھ کر انگریزوں کی طرح ہندوستانی بولتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے بعد زیادہ نرم دلی سے بولا۔

"ہم ولایت سے ابھی آتا ہے۔ دیکھو کوئی سوڈا واٹر کا دکان اِدھر ہے۔"

باکھا بے خبری میں پکڑا گیا۔ وہ اس صورتِ حال سے نباہ نہ کر سکا۔ اِس لیے اس نے سر ہلا دیا کہ اسے نہیں پتہ۔ اس کی خوش قسمتی سے اس آدمی کا ایک دوست اِدھر ہی کھڑا تھا اور اس کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا جس کے بلّی کی طرح نازک خد و خال تھے۔ اس کا چہرہ اس کی چمکتی سیاہ آنکھوں اور لمبے سیاہ بالوں سے روشن ہو رہا تھا۔ یہ نوجوان اس کے پاس ہی آ کر کھڑا ہو گیا اور کسی شاعر کی طرح ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس لیے باکھا کے ناکافی جواب نے اس دیسی صاحب کو اپنی بیدا استعمال کرنے کے لیے نہیں اکسایا جیسا کہ عام حالات میں وہ ایسا کر سکتا تھا۔

"تمہیں مہاتما گاندھی کے خلاف ایسے برے کلمات استعمال کرنا زیب نہیں دیتا۔" باکھا نے نوجوان شاعر کو اپنے دوست سے آہستہ سے کہتے ہوئے سنا اور وہ ان دونوں آدمیوں سے پرے چلا گیا۔ ان دونوں کے گرداب کئی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ "مہاتما ہمارے زمانے کی آزادی دلانے والی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ ان کی بھی اپنی مجبوری ہے لیکن ...."

"بالکل" باکھا نے اس کے ساتھی کو مداخلت کرتے ہوئے سنا "میں یہی

کہہ رہا ہوں اور میرا سوال یہ ہے۔۔۔۔"

"ہاں لیکن سنو۔ میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی ہے" شاعر کہہ رہا تھا "ان کی مجبوریاں ضرور ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ بالکل صحیح ہیں۔ وہ چرخے کے ہندوستان میں دوبارہ رواج کا پرچار کر کے بھلے ہی ہندوستان کو باقی کی دنیا سے الگ تھلگ کرنے میں غلط ہوں کیونکہ موجودہ حالات میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اِس میں بھی ٹھیک ہیں۔ کیونکہ اِس میں ہندوستان کا قصور نہیں ہے کہ وہ غریب ہے۔ یہ دنیا کا قصور ہے کہ دنیا امیر ہے!۔۔۔۔۔"

"تم عجیب و غریب متضاد باتیں کر رہے ہو۔ تم شا کو پڑھتے رہے ہو" ایک آنکھ کے چشمے والا آدمی بیچ میں بول اٹھا۔

"ارے شا کو چھوڑو یار۔ میں تمہاری طرح گرا ہوا ہندوستانی نہیں ہوں جو یورو پین فلم سٹاروں پر مرتے ہیں" شاعر جھنجلا کر بولا "لیکن تمہیں پتہ ہے کہ صرف اقتصادی اصولوں کی بنا پر ہندوستان دنیا کے دوسرے ملکوں سے پیچھے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ایک ہے اس میں قدرتی ذرائع کی بہتات ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نے زراعت کو چنا ہے اور مشین سے احتراز کر کے نقصان اٹھایا ہے۔ اس کا علاج تو ہمیں کرنا ہوگا۔ میں مشین سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے اس سے گھن آتی ہے۔ لیکن میں اس معاملے میں گاندھی کی مخالفت کروں گا اور اسے منظور کر لوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہم سب اسے پسند کریں گے اور ہم اپنے غلام بنانے والوں کو اُن کی چال میں ہی مات دے دیں گے۔۔۔۔"

"وہ تمہیں جیل میں ڈال دیں گے" بھیڑ میں سے کوئی بیچ میں بول پڑا۔

"گاؤں کا آدمی جو اس دنیا کو مایا سمجھتا ہے مشین پر کام نہیں کرے گا" انگریزی لباس والے معزز آدمی نے اپنی ایک آنکھ کی عینک کو اس طرح سے ٹھیک کرتے ہوئے کہا کہ اس کی آنکھ میں نفرت بھری چمک صاف نظر آجائے۔

"یہ ہندوستان کی دانشمندی ہے کہ وہ اِن تمام باتوں کو قبول کرتا ہے"

شاعر نے زور دے کر کہا، ”ہم اپنی لمبی تاریخ میں حقیقت پسند رہے ہیں اور دنیا کی مادہ پرستی میں بھی جب اور جیسے وہ سامنے آئی، خون اور گوشت میں بھی، یقین کرتے آئے ہیں۔ اپنشدوں کے مطابق دنیا میں انسان بار بار جنم لیتا ہے اور جب وہ لافانی رشی اور منی بھی بن جاتا ہے تب بھی اسے نجات نہیں ملتی کیونکہ وہ خلائی اشیا کا جزو بن جاتا ہے اور پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم دوسری دنیا میں یقین نہیں رکھتے جیسا کہ یہ یوروپین آپ کو وشواس دلائیں گے کہ ہم رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی آدمی ایسا ہوا ہے جو اس دنیا کو چھلاوا مانتا تھا یعنی شنکر آچاریہ لیکن اسے تپ دق تھی جس کی وجہ سے اس میں کچھ دیوانگی تھی۔ شروع کے یوروپین عالم اپنشدوں کے اصل نسخے حاصل نہیں کر سکے۔ اس لیے وہ ہندوستانی فلسفے کو شنکر آچاریہ کے تبصروں کی روشنی میں سمجھتے رہے۔ مایا کا مطلب چھلاوے سے نہیں ہے، اس کا مطلب جادو ہے۔ یہ نظریہ ویدانت کے حسب سے نئے مترجم ڈاکٹر کمارا سوامی کا بھی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے یہ لفظ ان نظریات کے بہت قریب ہو جاتا ہے جو تمہارے چہیتے سائنس دانوں ایڈنگٹن اور جینز نے سطحی دنیا کی فطرت پر پیش کیے ہیں۔ وکٹوریہ کے عہد کے لوگوں نے ہمیں غلط سمجھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو پامال کرنے اور اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے عمل کو ایک فلسفیانہ پس منظر عطا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی عقل سے ایک چھوٹی سی عمدہ پری کہانی تراش لی: ”تم اس دنیا میں یقین نہیں رکھتے۔ تم سب کے لیے تو مایا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے ملک کی دیکھ بھال کرنے دو اور تم سب نروان حاصل کرنے میں جٹ جاؤ۔“ لیکن وہ سب اب ختم ہو گیا ہے۔ ان کی روایت کے عین مطابق جنھوں نے ہندوستانی فن تعمیر اور بت تراشی کی لاثانی مثالیں، ان کی پوری جسامت، توانائی اور شکل و ہیئت کے ساتھ ہمیں دیں، ہم مشین کو بھی منظور کر لیں گے اور اُن پر کام کریں گے۔ ہم ان یوروپینوں کی بیوقوفی کو صاف دیکھ سکتے ہیں جنھوں نے دولت کی مزاحمت کی۔ وہ وحشی تھے اور سونے کی عبادت میں ان کے دماغ خراب ہو گئے تھے۔ ہم ان تمام گڑھوں سے اپنے آپ کو بچا کر چل سکتے ہیں کیونکہ ہمیں اپنی چھ

ہزار سال پرانی نسل کا احساس ہے۔ یہ وہ نسلی احساس ہے جس نے تمام نظر با نا نظر آنے والی قدروں کو اپنایا۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کیا ہے۔ ہم اس کا پوشیدہ بہاؤ جانتے ہیں۔ ہم نے اس کے ترنم پر رقص کیا ہے، ہم نے اس سے پیار کیا ہے، جذبات میں بہہ کر نہیں بلکہ پورے خلوص اور شدت سے اپنے دلوں کے ذریعے اس تک پہنچ کر؛ اور اور وہ، اتنی دور تک کہ زندگی لامحدود نظر آتی ہے اور معجزات ممکن نظر آتے ہیں۔ ہم نئے جذبات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم ایک نئی آگہی سے واقف ہونا سیکھ سکتے ہیں۔ ہم اس امکان کے بارے میں کبھی سوچ سکتے ہیں جس میں ہم اپنے سیاہ اور بھورے جسموں کی پوشیدہ حرارت سے نئی نسلوں کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ زندگی ہمارے لیے ابھی تک ایک مہم ہے۔ ہم ابھی تک سیکھنے کے لیے مشتاق ہیں۔ ہم غلطی نہیں کر سکتے۔ ہمارے آقا معاملوں میں گڑبڑ کر جاتے ہیں۔ ہم معاملوں کو صاف دیکھ سکتے ہیں۔ ہم پوری رفتار سے مشینوں پر کام کریں گے جب کہ وہ گھبرا کر سٹیم انجن کے ساتھ ہی اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم ان سب چیزوں کو اپنانے میں اپنے دل و دماغ کو قائم رکھیں گے۔ ہم سونے کے غلام نہیں بن جائیں گے۔ ہم پر زندگی کو معتدل مزاج سے مگر مکمل طور پر دیکھنے کے لیے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔"

یہ تقریر کافی موثر تھی۔ اسے شعلہ بیانی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نہ صرف سننے والی بھیڑ پر ہی اثر پڑا بلکہ وہ انگریزی زدہ ہندوستانی بھی خاموش ہو گیا۔ باکھا پر تو گاندھی کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ اس کے لیے کسی اور کو توجہ سے سننا مشکل تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شاعر نے کیا کہا تھا اگرچہ اس نے اس کے الفاظ کو سمجھنے کی بڑی کوشش کی۔

"یہ کون آدمی ہے؟" بھیڑ میں سے کسی نے پوچھا

"اقبال ناتھ سرشار، نوجوان شاعر جو 'نواں جگ' کا ایڈیٹر ہے اور اس کا ساتھی مسٹر آر۔ این۔ بشیر ہے جو بی۔ اے (آکسن) اور بار۔ ایٹ۔ لا ہے۔" کسی نے اپنے آپ یہ اطلاع دے دی۔

لوگوں نے قبولیت اور جذبۂ تعریف کا کانا پھوسی کر کے اظہار کیا۔ بشیر کی

آواز دوسروں کی آواز سے اوپر اٹھی اور اس نے زہر خند سے کہا۔

"ہا ہا، ہا ہا، ہُوہُو، ہُوہُو۔ لیکن ان سب باتوں کا چھوا چھوت سے کیا تعلق ہے؟ میرا خیال ہے گاندھی کی یہ تلقین اس کے احساسِ کمتری کا اظہار ہے۔ ... میرا خیال ہے ..."

"میں جانتا ہوں کہ تمہارا کیا خیال ہے" شاعر نے بڑی تندی سے کہا اور کچھ لطف بھی پیدا ہوا جب وہ چلّا کر بولا۔ "میں تمہیں بتا دوں کہ جہاں تک چھوا چھوت کا تعلق ہے مہاتما بالکل صحیح راستے پر ہیں۔ اپنے سیاسی اور اقتصادی نظریوں کے مقابلے میں تم نے یہ تمام سستی اصطلاحیں جیسے احساسِ کمتری اور احساسِ برتری آکسفورڈ یونیورسٹی میں سیکھ تو لی ہیں مگر یہ سمجھے بغیر کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ تم غلامانہ ذہنیت سے انگریزوں کی ہر بات کی نقل کرتے ہو..."

"بالکل ٹھیک کہتے ہو" ایک کانگرسی والنٹیر چلایا "اس کی ریشم کی ٹائی اور بدیشی کپڑے کے سوٹ کو دیکھو جو وہ پہنے ہوئے ہے۔ اسے شرم آنی چاہیئے۔"

"ہر شخص کا نسب اور اس کا ماحول جدا ہوتا ہے" شاعر نے اپنے ہاتھ کی جنبش سے بدتمیز کانگرسی والنٹیر کو خاموش کرتے ہو کہا "ہم میں سے کچھ بڑے سر کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، کچھ چھوٹے کے ساتھ، کچھ میں آگے چل کر زیادہ کارگر قوت کے نشان ہوتے ہیں، کچھ میں کم طاقت کے، دس کروڑ لوگوں میں شاید ایک سنت ہوتا ہے اور بے شمار اوسط دماغ کے آدمیوں میں کوئی ایک عظیم ہوتا ہے۔ لیکن لازمی طور پر اگر ہم انسانیت کے نقطۂ نظر سے کہیں تو سب انسان برابر ہیں۔ کسان کو اس کے ہل سے ہٹا کر اس کا میل مٹی دھو دو تو وہ کسی سلطنت پر حکومت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔" ایک پرانی ہندوستانی کہاوت ہے۔ ہمارے غریب ترین کسان کی شائستگی، سمجھ اور ٹھہراؤ اس بات کا ثبوت ہے۔ کسی گاؤں والے کے پاس جا کر اس سے بات کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کتنا رحم دل ہے، آپ کی کتنی عزت کرتا ہے اور کتنی تمیز سے بولتا ہے۔ اور انسان کی برابری اس کے لیے کوئی نیا جذبہ نہیں ہے۔ اگر یہ چالاک برہمن، یہ پجاری جنھیں

اپنی گوری چمڑی پر گھمنڈ تھا کرم کے خالص فلسفے کو، دراوڑوں سے لے کر اب تک توڑ موڑ کر پیش نہ کرتے کہ انسان کے کرم اور اس کے کام متحرک ہیں اور یہ کہ ہر ایک شے فنا ہونے والی ہے اور تبدیل ہوتی ہے اور ان سب کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں پیدائش اور پھر پیدائش، پچھلے جنموں کے اچھے اور برُے کرموں پر ہوتی ہیں، تو ہندوستان، جمہوریت کی بہترین مثال پیش کر دیتا۔ دیکھئے نا ذات بھی تو ایک ذہنی برتری ہے جو پنڈتوں کی چالاکی پر مبنی ہے مگر یہ بھی اگر دوسرے طریقے سے دیکھا جائے تو پورے طور پر جمہوری عمل ہے۔ اونچی ذات کا ہائی کورٹ کا جج اپنی ذات کے قلی کے ساتھ آزادی سے کھا لیتا ہے۔ اس لیے ہم ذات پات کی نابرابری کو آسانی سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہماری زندگی کے فرسودہ میکانکی فارمولوں کو ہمیں ختم کرنا ہوگا۔ پرانی گھسی پٹی روایتوں کو ہٹ کر ایک نئے ولولے کے لیے جگہ دینی ہوگی۔ ہم ہندوستانی اپنے لوگوں سے اتنا مل جل کر رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے خاندان اور اپنے نسب کا اتنا خیال ہے۔۔۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" بشیر نے جھنجلا کر دخل اندازی کی۔

"ہمیں ذات پات کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں پیدائش کی بنا پر غیر مساوات کو اور ایسے پیشوں کو جنھیں بدلا نہیں جا سکتا، مٹانا ہوگا۔ ہمیں ہر ایک کے لیے یکساں حقوق، مراعات اور مواقع کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ مہاتما نے ایسا نہیں کہا لیکن انگریزوں کے تعزیراتِ ہند نے ذات کی قانونی اور سماجی بنیاد کو مسمار کر دیا ہے اور اس کے یہ قانون صرف کچہری کے سامنے ہر آدمی کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ ذات تو اب پیشوں کے تابع ہے۔ جب بھنگی اپنا پیشہ بدل لیں گے تو وہ اچھوت نہیں رہیں گے اور ایسا تو وہ بہت جلد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم مشین منظور کریں گے تو پہلا کام جو ہم کریں گے وہ یہ ہوگا کہ میلا صاف کرنے کے لیے کسی کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی یعنی ایک فلش سسٹم اپنایا جائے گا۔ پھر بھنگی چھوا چھوت کے کلنک سے آزاد ہو جائیں گے اور ان کا بھی ایک مرتبہ ہوگا جو ذات اور جماعت کی تفریق کے بغیر سماج میں ان کو

حق کے طور پر ملے گا۔"

"دراصل" بشیر نے مذاق اڑایا "زیادہ بہتر کام، زیادہ اچھی دلالی، زیادہ اجتماعی پیداوار، مال پر کوالٹی کنٹرول، بھنگیوں کی مطلق العنانی، مارکس والی مادہ پرستی اور یہ سب کچھ!"

"ہاں ہاں، یہ سب کچھ، لیکن نعرہ بازی اور سستی اشتہار بازی کے بغیر یہ تبدیلی میکانکی نہیں بلکہ بنیادی اور ٹھوس ہوگی۔"

"اچھا اب چلو بھی، یہاں کھڑے رہنے سے تو مجھے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔" بشیر نے اپنے چہرے کو پونچھنے کے لیے ایک ریشمی رومال نکالتے ہوئے کہا۔

بھیڑ اپنی مشہور ہستیوں کو دیکھ رہی تھی، گھور رہی تھی اور حیرانی سے تک رہی تھی اور تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی حتیٰ کہ وہ لوگوں کی اپار بھیڑ میں غائب ہو گئے جو گول باغ سے باہر جا رہی تھی۔

باکھا ایک طرف کو ہٹ کر کھڑا تھا تاکہ کسی کو چھو کر بھرشٹ نہ کر دے۔ وہ ان چند باتوں پر ایک مہمل انداز میں سوچ رہا تھا جو شاعری کی شعلہ بیانی سے اس کے پلے پڑی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ شاعر نے تو اس کے دل میں چھپے ہوئے سب اہم سوالوں کا جواب دے دیا ہوتا اگر وہ اتنے بڑے اور مشکل الفاظ استعمال نہ کرتا "وہ مشین" اس نے سوچا "جو میلے اور گندگی کو بغیر کسی کے ہاتھ لگائے صاف کر دے گی، میں حیران ہوں کہ کیسی ہوگی! کاش وہ رجسٹرڈ مین، شاعر کو کھینچ کر نہ لے جاتا تو میں اس سے پوچھ لیتا۔"

غروب ہوتے ہوئے سورج کی مدھم آنچ مغربی افق کو گلنار بنا رہی تھی۔ جیسے ہی باکھا نے آسمان کے کنارے کو اس زبردست چمک کے روشن ہالے سے منور ہوتے دیکھا تو اس نے اپنے اندر جلن کا احساس کیا۔ اس کا چہرہ جو چند لمحوں پہلے کے خیالات سے زرد ہو گیا اور بگڑ سا گیا تھا، مایوسی اور ناکامی کے عجیب و غریب تصادم سے سرخ ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی یادوں کی تلخی اور مصیبت نے اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑا رہا جہاں وہ درخت سے اتر کر ٹھہر گیا

تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ بے حد تھکا ہارا ہو۔ پھر مہاتما کی تقریر کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ”پرماتما آپ کو شکتی دیں کہ آپ اپنی آتما کی مکتی کے لیے آخر تک کام کرتے رہیں۔“ ”اس کا مطلب کیا تھا؟“ باکھا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مہاتما کا دھندلا سا، ہر جگہ موجود رہنے والا چہرہ، اس کے سامنے آ گیا۔ لیکن اُس سے اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن اس سے ایک خاص قسم کی طاقت ضرور حاصل کی جا سکتی تھی۔ باکھا نے مہاتما کی تقریر کے الفاظ یاد کیے۔ یہ سب باتیں اس کے ذہن میں صاف نمایاں تھیں ایک ایک، چھوٹی سے چھوٹی، خاص طور پر اُکا بھنگی کی کہانی اسے پھر یاد آ گئی۔ مہاتما نے ایک برہمن کا ذکر کیا تھا جو ان کے آشرم میں بھنگی کا کام کرتا تھا۔ ”کیا اِس کا یہ مطلب تھا کہ مجھے بھنگی کا کام کرتے رہنا چاہیئے؟“ باکھا نے اپنے آپ سے پوچھا ”ہاں“ اسے یہ طاقتور جواب ملا۔ ”ہاں“ باکھا نے کہا ”مجھے وہی کرتے رہنا چاہیئے جو گاندھی کہتے ہیں۔“ ”لیکن کیا میں ٹٹیوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکوں گا؟“ یہ پریشان کن خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ ”لیکن میں چھوڑ سکتا ہوں۔ کیا اُس شاعر نے نہیں کہا تھا کہ ایک مشین تھی جو میرا کام کر سکتی ہے؟“ اس بات کا تصور ہی کہ وہ کبھی وہ کپڑے نہیں پہن سکے گا جو صاحب لوگ پہنتے تھے اور وہ کبھی صاحب نہیں بن سکے گا، بڑا بھیانک تھا۔ ”مگر اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور اس نے اپنے ذہن میں اس انگریز پولیس آفیسر کی تصویر اُبھار لی جسے اس نے جلسے سے پہلے وہاں کھڑے ہوئے دیکھا گیا اور جس کی کسی نے پرواہ نہیں کی تھی۔

اس نے چلنا شروع کر دیا۔ اس کی صفات اس کے مضبوط جسم اور اس کی عمدہ سوجھ بوجھ میں مضمر تھیں۔ وہ ہر اس بات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے سنی تھی، اگرچہ وہ اسے پوری کی پوری سمجھ نہیں سکا تھا۔ جیسے جیسے وہ چل رہا تھا، وہ خاموش اور مطمئن تھا۔ اگرچہ اس کی روح میں جو کشمکش تھی وہ ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ مہاتما گاندھی کے لیے اپنے جوش و خروش اور اپنی بھدّی بیکار سی زندگی کی مشکلات کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔

آفتاب نیچے اتر آیا۔ افق کی زردی، گلابی اور نارنجی پن مل کر ایک گہری نیلاہٹ بن گئے۔ مٹھی بھر ستارے آسمان کے دل میں دھڑکنے لگے۔

وہ باغ کی ہریالی میں سے نکل کر سڑکوں اور راستوں سے اٹھتی ہوئی گرد کی ایک ہلکی سی دھند میں نکل آیا۔

جیسے ہی ایک ہلکا سا دھند لکا آیا اور چلا گیا، ایک جذبہ خلا اور وقت کی عظیم تبدیلیہ ... اسا آیا اور ربا کھاتے اپنے دل میں بکھرے ہوئے مختلف عناصر کو ... وقتی مگر واضح فیصلے کی شکل دے دی ... میں جاؤں گا اور اپنے ... ب کچھ بتادوں گا جو گاندھی نے ہمارے بارے میں کہا تھا" اس نے اپنے ... پ سے دھیمے سے کہا، "اور وہ سب کچھ بھی جو شاعر نے کہا تھا۔ شاید کسی روز میں اس شاعر کو ڈھونڈ لوں گا اور اس سے مشین کے بارے میں پوچھ لوں گا۔" اور وہ گھر کی طرف بڑھ گیا!